زینت حسام

گزرے دن، گزرتے دن

مجھے میٹھادر کے اس گھر کا صرف لکڑی کا وہ زینہ یاد ہے جس پر چلنے سے دھمک پیدا ہوتی تھی — ہم بچے اس پر کودکود کر چڑھتے اترتے اور وہ دھمک ایک گونج میں بدل جاتی یا پھر پرانی وضع کے خوبصورت نمونے والے ٹائلوں سے بنا چمکدار فرش۔ میٹھادر کے بازار میں واقع اس چھوٹے سے چار منزلہ مکان کے نچلے حصے میں جوتوں کی دکان تھی اور ہر منزل پر دو کمروں پر مشتمل ایک فلیٹ۔ پہلی منزل پر دادا دادی اور دادا کی پہلی مرحوم بیوی کی اولاد، جنھیں سب بچے محمود بھائی کہتے تھے، دوسری منزل پر بڑے ابّا کا کنبہ، تیسری منزل پر امی ابا اور ہم بہن بھائی (اس وقت ہم دو بہنیں اور دو بھائی تھے) اور چوتھی منزل پر چچا کا کنبہ۔ میں اسی گھر میں پیدا ہوئی تھی، کھارادر کے میٹرنٹی اسپتال میں کام کرنے والی ایک عیسائی نرس کی نگرانی میں۔

ابا بیس سال کی عمر میں، ستمبر ۱۹۴۷ء میں، کانپور سے کراچی آئے تھے، امی اور ایک سالہ ضیا (بھائی)، اور محمود بھائی کے ساتھ۔ پھر چچا اور تایا کا کنبہ آیا اور اس کے بعد دادا دادی کو بلایا گیا۔ چھوٹے تایا کانپور چھوڑنے کو تیار نہ ہوئے اور نہ ہی کوئی پھوپھا۔ لہٰذا چاروں پھوپھیاں اور ان گنت دوسرے رشتے دار وہیں رہے۔ نانی نانا اور ماموں ممانی امی کی خاطر پاکستان آ گئے تھے۔ دادا کا شمار مسلمانوں کے محلے کرنل گنج کے معزز لوگوں میں ہوتا تھا۔ دادا کا کپڑوں کی چھپائی، بلاک پرنٹنگ، کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ دادا نمازی پرہیزگار تھے اور انھوں نے بیٹوں کو بھی دین کی طرف راغب کیا۔ ایک مولوی بچوں کی تعلیم پر مامور تھے۔ بچے اسکول بھی جاتے، لیکن زور دینی تعلیم پر رہا۔ مولوی صاحب مغربی تعلیم کے سخت خلاف تھے اور دادا کو، بقول ابا، بھڑکایا کرتے کہ بچوں کو اسکول بھیجنے کی کیا ضرورت ہے۔ ابا باغی نکلے۔ مسجد سے بھاگتے۔ مولوی سے چڑتے۔ ابا کا کہنا ہے کہ ان خاندانی مولوی نے ابا کو دین کی طرف راغب کرنے کے

لیے اتنا زچ کیا کہ ابا کا دل دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم سے بھی اچاٹ ہوگیا۔ چھٹی پاس کرنے کے بعد ابا نے اسکول کا دوبارہ رخ نہ کیا۔ کاروبار سے بھی ابا کو رغبت نہ تھی۔ ان کے مشغلے تھے: فلمیں دیکھنا، کتابیں پڑھنا، دوستوں میں رہنا، گھومنا پھرنا، کباڑیوں کی دکانوں میں جانا، انوکھی چیزیں، خاص طور پر پرانے کیمرے، خریدنا اور تصویریں بنانا۔ تقسیم ہند سے پہلے ابا نے اپنی کھینچی ہوئی ایک تصویر السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا کے ایک انعامی مقابلے میں بھیجی تھی جس کو انعام بھی ملا تھا۔ ابا کے پاؤں میں چکر تھا، دل میں جنوں۔ لڑکپن ہی میں ہندوستان کے کئی شہر گھوم چکے تھے۔ اکثر دادا سے جھگڑ کر گھر چھوڑ جاتے۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں جب جرمنی نے برما پر حملہ کیا تو آسام خالی ہونے لگا۔ ابا نے ٹرین پکڑی اور آسام روانہ ہوگئے۔ ابا بتاتے ہیں وہ اس ٹرین میں واحد مسافر تھے۔ لڑکپن میں عشق ہوگیا تھا۔ ابا نے دھمکی دی کہ اگر اس لڑکی سے ان کی شادی نہ ہوئی تو وہ زہر کھالیں گے۔ لیکن دادا بھی ضد کے پکے تھے۔ ابا اس بات پر بھی گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ پھر ایک سال بعد امی سے ان کا بیاہ کر دیا گیا۔ امی دادا کی پسند تھیں۔

کراچی میں میٹھادر کے قریب کاغذی بازار میں بنارسی ساریوں، کمخواب، زربفت کا مشترکہ کاروبار شروع کیا گیا۔ دکان میں ایک دوچھتی ہوا کرتی تھی۔ ابا کو اب تک دکانداری سے دلچسپی نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے دوچھتی پر دیوار سے لگے لکڑی کے کھانچوں پر اپنی جمع کی ہوئی کتابیں سلیقے سے جمائیں۔ جب ابا کراچی آئے تھے تو کتابوں سے بھرے کئی صندوق کانپور کی کسی لائبریری کو دے دیے تھے اور صرف تین چار صندوق ہی ساتھ لا سکے تھے۔ دوچھتی میں فرش اور چاندنی بچھائی گئی تھی اور گاؤ تکیے رکھے ہوے تھے۔ دکان کی یہ دوچھتی دوپہر کے کھانے اور قیلولے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔ ابا یا تو دکان میں پائے ہی نہ جاتے، یا آتے بھی تو سب سے گپ شپ کر کے، دوچھتی میں بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتے۔ گھر چھوٹا تھا اس لیے وہاں دو چار کتابوں سے زیادہ نہ رکھتے تھے۔ کتابوں کا ذخیرہ، اردو ادب اور شاعری کے نسخوں، دیوانوں، ادب لطیف، عالمگیر، ہمایوں، ساقی اور دوسرے رسالوں کے انبار پر مشتمل تھا۔ پچاس کی دہائی میں پاکستان سے نکلنے والے تمام رسالوں—سویرا، نقوش، داستان گو، لیل و نہار، نصرت وغیرہ —کے شمارے ابا محنت سے سنبھال کر رکھتے تھے۔ اکثر رسالوں کی خود نیلے رنگ کی جلد بناتے اور اپنا نام emboss کرتے۔ یہ کام ابا کانپور میں بھی کرتے تھے۔ کتابوں کی دنیا سے میرا پہلا تعارف کاغذی بازار کی دکان کی اسی دوچھتی میں ہوا۔

میں جب پانچ برس کی ہوئی تو یہ مشترکہ خاندان میٹھادر سے اٹھ کر پیر الٰہی بخش کالونی کے ایک دومنزلہ مکان میں منتقل ہوگیا تھا جس میں لگے امرود کے پیڑوں کی پھل دار شاخیں دوسری منزل کے کمرے کی کھڑکی اور چھجے تک آتی تھیں۔ ہم بچے چلچلاتی دوپہر کی خاموشی میں کچے امرود توڑ توڑ کر کھاتے اور پیر کالونی کی خاک آلود گلیوں میں کھیلا

کرتے۔ ایک سال بعد پھر نقل مکانی ہوئی۔ دادا کا انتقال ہو چکا تھا۔ محمود بھائی اپنے کنبے کے ساتھ ملیر جا بسے تھے۔ اب ہم سب لوگ شہید ملت روڈ سے متصل پنجابی سوداگران ہاؤسنگ سوسائٹی میں واقع کرائے کے دومنزلہ مکان میں اٹھ آئے تھے جس میں چار فلیٹ تھے۔ ایک فلیٹ میں دہلی کا ایک مختصر سا خاندان تھا—والدین اور دو لڑکے: مسعود اور ہارون۔ باقی تین فلیٹوں میں بڑے ابا، چچا، اور ابا اپنے اپنے ڈھیر سارے بچوں کے ساتھ رہائش پذیر ہوے۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔

تب کراچی کی زمین ہم بچوں کے لیے ایک وسیع کائنات تھی۔ سوسائٹی میں اکادکا مکانات تھے۔ ہماری گلی میں صرف تین مکان تھے۔ ہمارے مکان سے متصل مالک مکان، تقی صاحب، کا گھر، اور گلی کے سرے پر ایک اور مکان۔ باقی پلاٹ خالی تھے۔ دوسری گلیوں میں بھی یہی صورتِ حال تھی۔ ہر گھر کے احاطے میں اور احاطے سے باہر مختلف طرح کے پیڑ پودے ہوتے تھے۔ امرود، آم، شریفے، گلاب، چنبیلی، موتیا احاطے کے اندر، اور باہر بادام، جامن، املی، نیم، گل مہر، بوگن ویلیا۔ ہمارے گھر کے عین مقابل ایک کھنڈر سا تھا۔ غالباً کسی نے چار دیواری اٹھائی تھی، پھر کسی وجہ سے دیواریں منہدم کر دی گئی تھیں۔ اینٹوں کے ملبے، ٹوٹی ہوئی دیواروں اور خودرو جھاڑیوں میں چھپکلیاں اور گرگٹ رینگا کرتے۔ احتشام بھائی جان اور انعام بھائی (میرے تایازاد بھائی) گنیں لیے ان گرگٹوں کا شکار کیا کرتے۔ مجھ سے چھ برس بڑے ضیا بھائی کا وقت انعام بھائی کے ساتھ گزرتا۔ نورالصباح، عائشہ، احترام (تایازاد)، صبیحہ (چچازاد)، میں، عذرا اور ریاض— ہم بچوں کا غول زیادہ وقت باہر ہی منڈلاتا رہتا۔ ہم سب بہن بھائیوں کو باہر گھومنے کی یکساں آزادی تھی۔ ہم گلیوں اور سڑکوں سے سگریٹوں کے خالی پیکٹ اکٹھا کر کے ان کے قلعے اور مینار بناتے، جن کو بنانے سے زیادہ ڈھانے میں لطف آتا۔ کانچ کی چوڑیوں کے ٹکڑے چن کر انھیں آگ دکھا کر زنجیریں تیار کی جاتیں۔ تب کراچی میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اتنے نہ ہوتے تھے۔ پلاسٹک کی تھیلیوں کا رواج نہ تھا۔ کاغذ کی پڑیوں یا پھر سلے ہوے کپڑے کے تھیلوں میں سودا آتا۔ سڑکوں پر کاغذ، سگریٹوں کے ڈبے اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں تو پڑی ہوتی تھیں، لیکن گیلا کچرا نہ ہوتا تھا۔

کراچی میں تتلیاں بھی بے تحاشا ہوتی تھیں۔ خاص طور پر برسات کے بعد تتلیاں امنڈ آتیں۔ ہم بچوں نے تتلیوں کو مختلف نام دیے ہوے تھے۔ سبز اور سیاہ ''بادشاہ تتلی''، نارنجی پروں پر سیاہ و سفید دھبے والی ''ملکہ تتلی''، نقرئی جامنی ''شہزادی تتلی''۔ انعام بھائی نے ایک چھوٹا سا جالی کا ڈبا بھی بنایا تھا جس میں وہ تتلیوں کو پکڑ کر بند کرتے۔ مجھے اور نورالصباح کو تتلیاں چھونے کا بڑا شوق تھا۔ ہم منت سماجت کر کے ڈبے سے تتلی نکلواتے پھر فخر کے ساتھ انگلیوں پر اترے رنگ ایک دوسرے کو دکھاتے۔ بارش کے بعد میدان میں بیر بہوٹیاں امنڈ آتیں اور سب بچے ماچس کی خالی

ڈبیاں لیے بیر بہوٹیوں کو پکڑنے میں شام کر دیتے۔ پھر اپنی اپنی ڈھونڈی ہوئی بیر بہوٹیاں گنی جاتیں اور پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر رکھی سرخ مخملی مخلوق پر انگلیاں پھیری جاتیں۔ آج ۱۹۹۵ء میں یہ بات یاد کرتے ہوئے بھی عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ کراچی میں کبھی بچے تتلیاں اور بیر بہوٹیاں پکڑا کرتے تھے۔ یا یہ کہ کبھی یہاں قدم قدم پر بڑے بڑے سبز پتوں والے بادام کے پیڑ ہوتے تھے اور زمین پکے ہوئے سرخ باداموں سے پٹی رہتی تھی۔ رفتہ رفتہ کراچی سے بادام، امرود، جامن، شریفے اور املی کے پیڑ غائب ہوتے گئے اور شہر سفیدے کی لپیٹ میں آ گیا۔

ابا اور امی دونوں ہی کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ امّی بتاتی ہیں جن دنوں مجھ سے دو سال چھوٹی بہن پیدا ہوئی، امی صالحہ عابد حسین کا ناول عذرا پڑھ رہی تھیں۔ میرے بڑے بھائی کا، میرا اور اس بہن کا نام مولانا احتشام الحق (جن سے دادا کے خاندانی مراسم تھے) نے تجویز کیا تھا: ضیاء الدین، زینت النسا، طلعت النسا۔ طلعت ان دنوں تین چار ماہ کی ہوگی۔ نام ساتویں دن طلعت رکھ دیا گیا تھا، لیکن امی کو عذرا ناول اس قدر بھایا کہ انھوں نے طلعت کا نام بدل کر عذرا رکھ دیا۔ امی ہم بچوں کو کہانیاں پڑھ کر سنایا کرتیں۔ کتابیں خریدنے کا شوق ضیا بھائی، مجھے اور عذرا کو بھی تھا۔ ہم لوگ جیب خرچ کا زیادہ حصہ کتابیں اور رسالے خریدنے میں صرف کرتے۔ اس زمانے میں بچوں کی (اردو) کہانیاں چار آٹھ آنے، روپے دو روپے میں آتی تھیں۔ انگریزی کی Archie کامکس اور رنگین، باتصویر، عمدہ نیوز پرنٹ پر چھپی fairy tales ایک روپے میں ایک ملا کرتیں۔ یہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کی بات ہے۔ ہم بچوں کی کتابیں اور رسالے تو گھر ہی میں لڑھکتے پھرتے لیکن ابا اب تک اپنی کتابیں اور رسالے کاغذی بازار میں واقع دکان کی دو چھتی ہی میں ذخیرہ کر رہے تھے۔ دو کمروں کا تنگ فلیٹ تھا اور بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد۔ ابا صرف چند ایک کتابیں دیوار میں بنی الماری میں رکھا کرتے جس کے پٹ ہمیشہ بند رہتے۔ رات کو سونے سے پہلے بستر پر لیٹ کر ابا مجھ سے الماری کھلواتے جس کی کنڈی مجھے مونڈھے پر چڑھ کر کھولنی پڑتی۔ پھر ایک کتاب نکلواتے — مجھے صرف ایک کتاب یاد ہے، ممتاز مفتی کی علی پور کا ایلی۔ یہ ایک بے حد ضخیم کتاب تھی، مجلد، اور سبز اور خاکی ڈسٹ کور پر غالباً ٹڈے بنے ہوئے تھے۔ میں یہ کتاب مونڈھے پر چڑھ کر احتیاط سے نکال کر ابا کو دیتی۔ ٹڈے کی سرورق پر بنی تصویر دیکھ کر ایک دفعہ میں نے پوچھا، ''ابا، کیا یہ ٹڈے کی کہانی ہے؟'' اور ابا نے ہنس کر کہا تھا ''ہاں۔'' ابا سے مجھے ایک شکایت تھی۔ وہ اس کتاب کے دو چار یا آٹھ دس صفحے پڑھ کر، نشانی لگا کر، مجھ سے واپس رکھوا دیتے۔ مجھے یہ بے صبری کہ آخر ابا اسے فوراً پورا کیوں نہیں پڑھ ڈالتے۔

ابا کو گاڑی چلانے کا بڑا شوق تھا۔ وہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی خریدتے اور ہر سال گاڑی تبدیل کرتے۔ کبھی آسٹن، کبھی ہلمین۔ فورڈ کی سفید اسٹیشن ویگن کی یاد بے حد واضح ہے۔ وہ ہم بچوں کو بہت پسند تھی۔ پچھلے حصے میں بیٹھ کر ڈکی کا

دروازہ کھلا رکھا جاتا۔ خاندان کے تمام بچوں کو گاڑی میں بھر کر ابا سیر کرانے لے جاتے۔ کلفٹن میں کوٹھاری پریڈ ہم بچوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ ہم سب گنبد نما کھلی عمارت کے اطراف جو دھ پوری پتھر کی بنی چکنی ڈھلان پر چڑھ کر پھسلا کرتے۔ اتوار کے اتوار ہاکس بے، سینڈز پٹ اور پیراڈائز پوائنٹ کا چکر لگتا۔ اکثر شام کو صدر میں واقع کیفے جارج میں ہم بچوں کو آئس کریم کھلانے لے جاتے۔ منگھوپیر بھی ایک دو دفعہ گئے۔ سٹی ریلوے اسٹیشن اور ایرپورٹ بھی تفریح کی غرض سے جایا کرتے۔ ابا کے ایک دوست تھے، ایم ایف آئس کریم فیکٹری کے مالک۔ ہم بچے اکثر ابا کے سر ہو جاتے کہ ہمیں ان کی فیکٹری کی سیر کرائیں۔ فیکٹری ملیر کے مضافات میں تھی اور آس پاس ان کے امرود کے باغات ہوا کرتے تھے۔ پہلے باغ جا کر جی بھر کر امرود کھائے جاتے۔ پھر فیکٹری کی سیر کرتے — آئس کریم کے لالچ میں۔ آئس کریم سے نہ صرف وہیں خاطر تواضع کی جاتی بلکہ ایم ایف آئس کریم کے ڈبے بھی تحفے میں ملتے۔ ہم بچوں کا ہر شام موٹر میں سیر کرنا لازمی ہوتا۔ اگر کہیں دور نہیں تو ابا ہمیں سوسائٹی کی گلیوں ہی کے چکر لگانے لے جاتے۔ ہل پارک کے قریب ایک گلابی رنگ کا بنگلہ تھا۔ گنبدوں، محرابی کھڑکیوں اور محرابی دروازوں والے اس منفرد بنگلے کے دو گیٹ تھے، لکڑی کے، اور اندر بڑا سا پورچ تھا۔ ہم بچوں کو یہ گھر بڑا سحر انگیز دکھائی دیتا، بالکل پریوں کا محل۔ اس بنگلے پر اکثر سناٹا چھایا رہتا اور دونوں گیٹ ہمیشہ کھلے ہوتے۔ ابا ایک گیٹ سے گاڑی اندر گزارتے اور دوسرے گیٹ سے نکال لیتے اور ہم بچے، سحر زدہ، اس کے در و دیوار دیکھتے رہ جاتے۔ گو اس بنگلے کا رنگ آج بھی گلابی ہے لیکن اب اس کے در و دیوار پر اس فسوں، معصومیت اور مہمان نوازی کی جگہ کرختگی اور سرد مہری نے لے لی ہے۔ دیواریں بلند ہو چکی ہیں اور بند آہنی گیٹوں کے باہر ایک چوکیدار بیٹھا ہوتا ہے۔

سال میں ایک دفعہ ایک تفریح کا موقع بندر روڈ پر بھی ملتا۔ یہ دس محرم کو نکلنے والے تعزیے اور علم کے بڑے جلوسوں اور ماتم کے دیدار کا موقع ہوتا۔ یہاں ہم ماموں کے ساتھ جایا کرتے۔ نانا، نانی، ماموں اور ممانی اور میری ہم عمر خالہ ملیر میں رہتے تھے۔ یہ شیعہ محلہ تھا۔ آٹھ دس گھر سنیوں کے بھی تھے۔ ہم بچے آٹھ محرم سے نانی کے گھر رہنے آ جایا کرتے۔ محلے میں ہونے والی مجلسوں میں شریک ہوتے۔ چھریوں کا ماتم اور ذوالجناح دیکھنے کے چکر میں نو اور دس محرم کی راتوں کو جاگتے رہنے کی کوشش کرتے۔ جب نیند سے آنکھیں بوجھل ہونے لگتیں تو امی، نانی یا ممانی کو تاکید کر کے کہ ہمیں جلوس کے وقت ضرور اٹھائیے گا، صحن میں بچھی چارپائیوں پر پڑ کر سو جاتے۔ واقعتاً ہمیں جلوس نکلنے پر جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا جاتا اور ہم بچے دروازے کھول کر دہلیزوں پر کھڑے ہو جاتے۔ تنگ گلیوں سے جب جلوس اور ذوالجناح گزرتے تو یہ سب اتنے قریب سے دیکھنے کی عجب خوشی ہوتی۔ بندر روڈ پر البتہ گھروں کی چھتوں پر چڑھ کر ماتم دیکھا جاتا۔ اس زمانے میں لوگ گھروں کے دروازے کھلے ہی رکھتے تھے، اور بندر روڈ پر رہنے والے اتنے مہمان نواز

ہوتے تھے کہ سب کو چھتوں اور منڈیوں پر ٹک کر جلوس دیکھنے کی بخوشی اجازت دے دی جاتی تھی، خاص طور پر بچوں کو۔

اسی زمانے میں ابا نے سراج الدولہ روڈ کے اس پار دارالامان ہاؤسنگ سوسائٹی میں زمین خریدی۔ مکان کی تعمیر شروع ہوئی۔ اب ہم بچوں کی آوارہ گردی کا دائرہ وسیع تر ہوگیا۔ پلاٹ پر جانے کے بہانے ہم آس پاس کی گلیوں اور تھوڑے فاصلے پر واقع پہاڑی تک جانے لگے۔ یہ پہاڑی، جو اب ہل پارک کہلاتی ہے، بڑے بڑے پتھروں، جنگلی جھاڑیوں، خودرو پودوں اور گھاس پھوس سے ڈھکی ہوتی تھی۔ پہاڑی پر دو تین پگڈنڈیاں ہوتی تھیں جنھیں لوگ سوسائٹی کے دوسرے حصے کو عبور کرکے ڈرگ روڈ (شارع فیصل) تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتے۔ لیکن پہاڑی پر ہم بچے کبھی اکیلے جانے کی ہمت نہ کر پائے۔ احتشام بھائی جان کے پیچھے پڑتے کہ پہاڑی پر چلیں، اور سب بچے ان کے پیچھے پیچھے بھاگتے دوڑتے پہاڑی پر چڑھتے۔ پہاڑی کے اوپر سے دوسری طرف ڈھلان پر بنے مکانات کھلونے اور سڑک پر چلتی موٹریں ماچس کی ڈبیاں نظر آتیں۔

ہم سب بچے دہلی مرکنٹائل سوسائٹی (ڈی ایم ایس) اسکول میں پڑھتے تھے جو گھر کے قریب ہی تھا۔ جب میں پانچویں جماعت میں آئی تو لڑکیوں کی علیحدہ شاخ کھلی جو شہید ملت روڈ کے پار کوکن سوسائٹی میں واقع تھی۔ شہید ملت روڈ اس زمانے میں ایک تنگ اور ٹوٹی پھوٹی دورویہ سڑک ہوا کرتی تھی جو ڈرگ روڈ کو جیل روڈ سے ملاتی تھی۔ سڑک کی دو پٹیوں کے درمیان ایک وسیع و عریض میدان تھا۔ گھر سے اسکول تک پندرہ منٹ کا فاصلہ تھا اور ہم بچے کھیلتے کودتے، شہید ملت روڈ کا میدان پار کرتے اسکول پہنچتے۔ (یہ سڑک ستر کی دہائی کے وسط میں چوڑی ہوئی۔) اسکول کے بعد اکثر میں، نورالصباح اور دو تین سہیلیاں گھر کی طرف لوٹتے اور گھر سے آگے واقع جھیل پارک چلے جاتے۔ (یہ سوسائٹی کا وہی پارک ہے جو ستر کی دہائی کے آخر میں کٹ کٹا کر چھوٹا ہوا، اسّی کی دہائی میں یہاں رہائشی منصوبہ شروع ہوا جو شہریوں کے دباؤ کی وجہ سے اب تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔) مجھے یہ باغ بے حد پسند تھا۔ اس کی وجہ نفاست سے تراشی ہوئی ہری بھری باڑھیں تھیں جو باغ کو چھوٹے چھوٹے چوکور احاطوں میں تقسیم کرتی تھیں۔ یہ سبز دیواریں ہمارے قد سے اونچی ہوا کرتی تھیں۔ ہم ان سبز دیواروں کے گرد گھومتے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی دنیا میں گم ہوجاتے۔ بے شک جب ہم باغ سے واپس لوٹتے تو پوچھا جاتا کہ ہم کہاں تھے، لیکن یہ ہماری ماؤں کے لیے کوئی ایسی پریشان کن بات نہ تھی۔ وہ پرسکون دور تھا کراچی کا۔ مجھے یاد ہے کہ ہم بچیوں کی طرف سے ہماری اماؤں کو صرف ایک دفعہ پریشانی لاحق ہوئی تھی کہ بچیوں کے کانوں سے سونے کی نازک بالیاں کوئی اتار نہ لے۔ ہوا یوں کہ ایک دفعہ میری چھوٹی تایازاد بہن روتی ہوئی گھر پہنچی کہ ایک بابا نے اس کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار لی ہیں۔ اس واقعے کا ردعمل صرف یہ ہوا تھا

کہ ہم سب بچیوں کے کانوں سے سونے کی بالیاں اتار دی گئی تھیں۔ ہمارا گھومنا پھرنا اسی طرح جاری رہا تھا۔

ساٹھ کے عشرے میں طارق روڈ پر کیفے لبرٹی کے آس پاس چند دکانیں کھل چکی تھیں۔ یہ اسٹیشنری، کتابوں اور کپڑوں کی دکانیں تھیں۔ لندن بک ہاؤس، گلستان بک اسٹال، اور پچھلی گلی میں (جواب دوپٹہ گلی ہے) ایک دو اسٹیشنری کی دکانیں اور ایک چھوٹی سی لائبریری ہوا کرتی تھی۔ طارق روڈ ہمارے گھر سے پندرہ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں اور عذرا ہفتے میں کئی چکر لندن بک ہاؤس اور لائبریری کے لگاتے۔ کتابوں کے علاوہ ہم دونوں کو paper dolls جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔ لندن بک ہاؤس سے باقاعدگی سے یہ کاغذ کی گڑیاں خریدی جاتیں۔ ہم دونوں اکثر اکیلے ہی طارق روڈ جایا کرتے تھے۔ کتابوں کا شوق ہم اس زمانے میں ایک چلتی پھرتی لائبریری سے بھی پورا کرتے تھے۔ اس لائبریری کا مالک ایک نرم گو، شفیق چہرے والا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا جو ایک سائیکل کی پشت پر بندھے بڑے سے تھیلے میں بچوں کی کتابیں ڈالے سوسائٹی میں گلی گلی آواز لگاتا گھوما کرتا۔ یہ لائبریری والا ہفتے میں دو تین دفعہ ہماری گلی میں بھی آتا۔ ہم بچے اس کا بے چینی سے انتظار کرتے۔

نیا گھر بننے میں چار پانچ سال لگے۔ وجہ مالی مشکلات تھیں۔ آخر جب کرائے کے مکان میں رہنا مشکل ہو گیا تو ابا نئے مکان میں اٹھ آئے گو کہ ابھی چھوٹے موٹے کافی کام باقی تھے۔ گھر میں گیٹ بھی نہیں لگا تھا۔ امی، ابا اور ہم بچے (اب ہم چار بہنیں، چار بھائی تھے) نیچے کی منزل میں مقیم ہوئے اور اوپر تایا اور چچا کے کنبے آباد ہوئے۔ یہ گھر ابا نے روایتی طرز پر بنوایا تھا، یعنی بیچ میں ایک آنگن تھا جس کے تین طرف کمرے، باورچی خانہ، غسل خانہ تھا اور چوتھی سمت ایک چھوٹی سی کھلی جگہ تھی، باغیچہ نما۔ کیاری میں پیڑ پودے لگائے گئے تھے — رات کی رانی، دن کا راجہ، چمپا اور چنبیلی — اور درمیان میں گھاس لگانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس باغیچے اور گیراج کے درمیان کوئی دیوار نہ تھی اور آنگن بھی کھلا تھا۔ یعنی گیٹ سے داخل ہو کر بجائے صدر دروازے کے اس کھلی جگہ سے آنگن اور پھر کمروں میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ مالی دشواریوں کی بنا پر ابا تقریباً تین سال تک گیٹ نہ لگوا سکے۔ لیکن ہم سب اپنے کمروں کے دروازے کھلے رکھ کر اس تمام عرصے چین کی نیند سوتے تھے۔ اب تو کراچی کے وہ دن مٹھی میں ریت کے مانند ہاتھ سے نکل چکے ہیں۔

گھر کے آنگن اور اس چھوٹے سے باغیچے کے ساتھ ایک بے حد خوش کن اور منفرد یاد وابستہ ہے۔ وہ یاد ہے چارلی چیپلن کی فلموں کی۔ ابا کو موسیقی، فلموں اور فوٹوگرافی کا شوق تھا۔ ابا کے پاس دو پروجیکٹر تھے۔ ایک چھوٹا سیکنڈ ہینڈ، خاموش فلموں کے لیے، اور دوسرا بڑا، جو ابا ۱۹۵۸ء میں جاپان سے خرید کے لائے تھے (ابا کا بزنس کے سلسلے میں جاپان جانا ہوا تھا)۔ ابا اس زمانے میں USIS کے ممبر تھے۔ چارلی چیپلن اور ڈاکیومنٹری فلموں کی ریلیں وہیں سے

لائی جاتیں۔ رات کے کھانے کے بعد باغیچے کی دیوار سے لگی کپڑے سکھانے کی ڈوری پر ایک سفید دھلی ہوئی چادر لٹکائی جاتی، ابا پروجیکٹر سیٹ کرتے، چھوٹے پایوں والے نواڑ کے دو پلنگ اور گھر میں پائی جانے والی تمام کرسیاں نکال کر آنگن میں بچھائی جاتیں، آنگن اور کمروں کی بتیاں گل کی جاتیں، اور ہم بچے اپنی اپنی سیٹیں سنبھالتے۔ کیاری میں لگی رات کی رانی اور چنبیلی کی مہک سے لبریز، کراچی کی خوشگوار ہوا آنگن میں تیرتی، اور ہم سب چارلی چیپلن کی مزیدار حرکتوں پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا کرتے!

لیکن ابا کبھی ہم بچوں کو فلم دکھانے سینما ہال نہیں لے گئے۔ ہندوستانی اور انگریزی فلمیں ابا اپنے دوستوں کے ساتھ دیکھا کرتے۔ ابا کے اَن گنت جگری یار تھے — دہلی کے تاجر وحید صاحب، بنگال کے بیوروکریٹ عالم صاحب، بہار کے انجینئر سید صاحب، پنجاب کے ٹھیکے دار شیخ صاحب، اور کراچی کے پارسی بلیموریا صاحب۔ سوائے ان بلیموریا صاحب کے، باقی سب کے گھروں میں امی اور ہم بچوں کا آنا جانا تھا۔ سب سے زیادہ دوستی وحید صاحب اور عالم صاحب کی فیملی سے تھی کیونکہ ان کے بچے ہم بچوں کے ہم عمر تھے۔ سید صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی لیکن ان کی سوشیالوجی میں ایم اے پاس بیوی سے امی کی اچھی دوستی ہوگئی تھی۔ بلیموریا صاحب کے ہاں اولاد نہ تھی، اور غالباً ابا کا خیال ہوگا کہ امی کی دوستی مسز بلیموریا سے شاید نہ ہو پائے، اس لیے وہ ہمیں بچپن میں ان کے گھر نہیں لے گئے۔ لیکن گھر میں بلیموریا صاحب کا تذکرہ اسی زور شور سے ہوا کرتا تھا۔

امی کو بھی فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ امی نے زیادہ تر فلمیں بیگم وحید اور بیگم عالم کے ساتھ دیکھیں۔ عالم صاحب انوسٹمنٹ پروموشن بیورو میں ڈائریکٹر ہوا کرتے تھے اور جمشید کوارٹرز میں ان کی رہائش تھی۔ وحید صاحب فریئر روڈ کے ایک فلیٹ میں رہا کرتے تھے۔ پھر انھوں نے پی ای سی ایچ سوسائٹی میں مکان بنوایا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ اکثر دوپہر میں امی چھوٹے بچوں کو زبیدہ چچی کی نگرانی میں ایک سواتی آیا کے حوالے کر کے میرے ساتھ چپکے سے نکل آتیں۔ پھر ہم دونوں رکشا میں عالم صاحب کے گھر پہنچتے۔ مسز عالم اور ان کی بیٹی شائستہ، جو میری ہم عمر تھی، فلم دیکھنے کے لیے بالکل تیار ہوتیں۔ وہ بھی اپنے چھوٹے بچوں کو پڑوسن کے حوالے کرتیں اور ہم چاروں پیدل فلمستان یا ناولٹی سینما پہنچتے اور سکون سے میٹنی شو دیکھا جاتا۔ اس طرح میں اسکول کے زمانے میں راج کپور اور نرگس کی پرستار بنی۔ آہ، آوارہ، انداز، برسات اور بہت سی دوسری فلمیں دیکھیں۔ جب ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ہندوستانی فلموں پر پابندی لگی تو مشرقی پاکستان میں بننے والی اردو فلمیں آخری اسٹیشن، چندا، چکوری، تلاش وغیرہ بڑے شوق سے دیکھیں۔

عالم صاحب کے گھر ہم سب کو بہت مزہ آتا۔ سب سے بڑی شائستہ، اس سے چھوٹا شاہد اور پھر پیار (جس کا

اصل نام کچھ اور تھا)، شہناز اور محمود۔ بچے تو رواں اردو بولتے لیکن مسز عالم دو چار جملے ہی بول پاتیں۔ آپس میں وہ سب ہمیشہ بنگالی بولتے۔ اکثر ہم لوگ ایک دوسرے کے گھر دعوتیں کھایا کرتے۔ ہمیں ان کی مچھی بھات ترکاری مزیدار لگتی اور انھیں امی کے ہاتھ کے پکے کھانے بھاتے۔

شائستہ اور میں تیرہ چودہ برس کے ہو رہے تھے۔ شائستہ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں اور مکھن جیسی ملائم سنہری جلد والی پرکشش لڑکی تھی اور میں ایک گول چہرے، چپٹی ناک، اور نکلتے مہاسوں والی معنک ٹین ایجر۔ شائستہ مجھے لڑکوں کی باتیں بتاتی۔ پڑوس کے لڑکے، محلے کے لڑکے، اس کے اسکول کے سامنے بس اسٹاپ پر کھڑے ہونے والے شہر کے کالجوں کے لڑکے جو اس پر عاشق تھے۔ مجھ پر کوئی عاشق نہ تھا۔ میں رشک سے شائستہ کی باتیں سنا کرتی۔ لڑکپن کی یہ گہری دوستی ۱۹۷۰ء میں ایک شام اداس کن موڑ پر پہنچ کر ختم ہوئی جب عالم صاحب کا خاندان کراچی چھوڑ کر ڈھاکے جا بسا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی اور موجودہ عشرے کے درمیان تیس برس گزر چکے ہیں۔ تیس برس۔ ان تیس برسوں میں اس شہر، اس زمین آسمان اور شہر کے مکینوں کی زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئی ہیں۔ تیس برس اتنا طویل عرصہ تو نہیں — یا شاید ہے۔ لیکن کیا کسی شہر کے مکیں تین عشروں میں اتنی سنگین تبدیلیوں کے متحمل ہو سکتے ہیں؟

❄

ملیر کی گلیاں

ملیر کی یادوں کے ساتھ ہرے بھرے پیڑ وابستہ ہیں: امرود، آم، انار، نیم، گلاب، چنبیلی، موتیا۔

ہم بچے نانی کے گھر ہر ہفتے جایا کرتے۔ نانا اور ماموں کے کوارٹر ملے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر میں ایک کمرہ اور ایک بڑا سا آنگن تھا۔ نانا نانی کے ساتھ خالہ رہتی تھیں، اور ماموں، ممانی اور ان کے تین بیٹے ایک ساتھ۔ دونوں کوارٹروں کی درمیانی دیوار نہ تھی لہٰذا یہ ایک بڑا سا گھر نظر آتا۔ نانی کے آنگن میں امرود کے تین چار پیڑ قطار سے لگے ہوئے تھے اور ایک انار کا درخت تھا۔ ماموں کی طرف ایک بڑا سا نیم کا پیڑ اور موتیا، چنبیلی، اور گلاب کی جھاڑیاں تھیں۔

چھٹیوں کی دوپہر ہم بچے درختوں پر چڑھتے، امرود توڑ توڑ کر کھاتے، آنکھ مچولی کھیلتے۔ شام کو سڑک کے اس پار ملیر ریلوے اسٹیشن کی سیر کو جاتے اور اسٹیشن کے باہر ریل کی پٹریوں کے نیچے بنی پلیاؤں کے اندر بیٹھ کر اوپر سے جاتی

ہوئی ٹرین کی آواز سنتے۔ رات کو نانی چارپائیوں پر صاف ستھرے بستر لگاتیں اور ہمیں کہانیاں سناتیں، اور ہم تاروں بھرے آسمان کو تکتے تکتے سو جاتے۔ یہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کی بات ہے۔

تب ملیر کے ہر کوارٹر میں آنگن اور پیڑ ہوتے تھے اور گلیاں صاف ستھری۔ ہواؤں میں امرود کی مہک اور چنبیلی کی خوشبو بسی ہوتی۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے پیڑوں کو کاٹ کر اضافی کمرے بنانے شروع کیے۔ کچے آنگن پکے ہوتے گئے۔ پیڑوں کی تعداد گھٹتی گئی۔ گلاب اور چنبیلی کی جھاڑیاں بھی بتدریج کم ہوتی گئیں۔ کمروں کے باہر ٹین کے شیڈ ڈال کر برآمدے بنائے گئے۔ یہ ۱۹۷۰ء کے عشرے کا ذکر ہے۔

آبادی بڑھتی رہی۔ اسّی مربع گز پر بنے ہوادار اور روشن گھر گھٹے ہوئے، چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں والے، تاریک ایک منزلہ، دومنزلہ بدصورت مکانوں میں تبدیل ہو گئے۔ گلیوں کی چوڑائی کم ہوگئی کیونکہ لوگوں نے گھروں کے باہر ناجائز احاطے تعمیر کر لیے اور سیاہ آہنی گیٹ لگا لیے تھے۔ پیڑوں کی شاخوں کی جگہ اب ٹی وی اینٹینوں، سیاسی جماعتوں کے رنگ برنگے جھنڈوں اور ٹیلی فون کے بےہنگم تاروں نے لے لی تھی۔ یہ ملیر کالونی تھی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں۔

اور آج، اپریل ۱۹۹۵ء کی ایک صبح، میں ملیر کی ایک پکی سڑک پر چلتے ہوئے اس حصے پر قدم رکھتی ہوں جو کلاشنکوف کی گولیوں کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے چھلنی اور ایک انسان کے خون سے سیاہ ہے — وہ انسان جسے آج سے پندرہ دن قبل سڑک کے اسی حصے پر سفاکی سے قتل کیا گیا۔ میں ان تبدیلیوں کو گرفت میں لانے کی کوشش کرتی ہوں جو گزشتہ تین دہائیوں میں اس زمین اور اس زمین کے باسیوں کی روح میں در آئی ہیں۔ کتنی گمبھیر تبدیلیاں ہیں یہ۔ اور کتنا مسخ کر دیا ہے انھوں نے ملیر کو، جو کبھی ایک سرسبز اور پرامن وادی تھی؛ اور اس کے مکینوں کی روح کو، وہ سادہ لوح، مہمان نواز مکیں جو پیڑوں، پھلوں، پھولوں، سبک ہواؤں اور زندگی سے محبت کرتے تھے۔

اس منظر کی تصویر میرے ذہن کے دریچے میں ثبت ہو کر رہ گئی ہے: دوپہر کا وقت ہے۔ زندگی کا کاروبار جاری ہے۔ سڑک کے کنارے بنی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں گاہک کھڑے اشیائے صرف کی خریداری میں مصروف ہیں۔ بچے گلیوں میں کھیل رہے ہیں اور عورتیں گھروں کی دہلیز پر کھڑی ایک دوسرے سے باتیں کر رہی ہیں۔ ایک کار سڑک پر رکتی ہے۔ سامنے حلوائی اور ڈرائی کلینر کی دکانیں ہیں۔ گاڑی میں سے تین مسلح آدمی اترتے ہیں، ڈکی کھولتے ہیں۔ ایک ادھ موئے، نیم جان، کمر تک ننگے آدمی کو نکالتے ہیں جس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے ہیں، اور اسے تپتی ہوئی تارکول کی سڑک پر پھینکتے ہیں، اس پر کلاشنکوف سے گولیوں کی بوچھاڑ کرتے ہیں، پھر اس کے چہرے پر ٹھوکر مار کر اطمینان کرتے ہیں کہ وہ مر چکا ہے یا نہیں، اور جب اس کا خون آلود ساکت چہرہ ایک طرف ڈھلک جاتا ہے تو گاڑی کا دروازہ کھول کر اطمینان سے بیٹھتے ہیں اور گاڑی آہستہ خرامی سے سڑک پر چلتی ہوئی لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔

لاش تین گھنٹے خون کے تالاب میں ڈوبی پڑی رہی۔ ایک تنومند، گبھرو جوان تھا۔ کوئی لاش کے قریب نہ پھٹکا۔ سڑک پر زندگی کا کاروبار جاری رہا۔ البتہ ایک وحشت ناک خاموشی پھیل چکی تھی۔ لوگ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنے کام جلدی جلدی نمٹا رہے تھے اور لاش کو کنکھیوں سے دیکھ رہے تھے۔ آخر کار تین گھنٹے بعد ایدھی کی ایمبولینس پہنچی اور لاش اٹھا کر لے کر گئی۔ ''ہفتہ بھر وہ لاش مردہ خانے میں پڑی رہی۔ پھر کہیں جا کے اس کی شناخت ہوئی۔ پتا چلا کوئی فوجی تھا،'' سفید بالوں اور جھریوں بھرے چہرے والی بزرگ خاتون موضوعِ سخن سے ہٹ چلی ہیں۔ میں ملیر کے اس گھر میں بیٹھی ان کے نوجوان بھتیجے کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی ہوں جو چند ماہ پہلے اس گھر کے اندر قتل ہوا تھا۔

''خدا رحم کرے ہم سب پر۔ ہمیں کیا ہوگیا؟ کیا ہمارے اندر شیطان حلول کر گیا ہے؟'' مقتول نوجوان کی پھوپھی، تسبیح ہلاتی ہوئی، تیز تیز بولے جا رہی ہیں۔ مقتول کی ماں کسی سوئم میں گئی ہوئی ہیں اور میں گھر کی عورتوں سے بات کر رہی ہوں۔

''لوگ اتنے بے درد، اتنے بے رحم ہو گئے ہیں۔ اس طرح ایک دوسرے کو قتل کر رہے ہیں کہ بھیڑ بکریوں کو بھی ایسے ذبح نہیں کیا جاتا۔۔۔'' مقتول کی چچی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ ''ساتواں روزہ تھا۔ میں ظہر کی نماز کے بعد تسبیح پڑھ رہی تھی۔ ریحان دوسرے کمرے میں نماز پڑھ رہا تھا۔ ریحان کی ماں بھی نماز پڑھ رہی تھیں۔ دودھ والا دودھ دے کر پلٹا تھا اور میں دودھ کی تھیلی ہاتھ میں لیے باورچی خانے کی طرف مڑی ہی تھی کہ اتنے میں سفید کار گھر کے گیٹ پر رکی، تین آدمی بڑی بڑی بندوقیں لیے دڑاتے ہوئے اندر آ گئے اور چلّا کر پوچھا: ریحان ہے؟ انھوں نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور سیدھے اندر چلے گئے۔ ہمارے گھر کے ساتھ والا مکان ریحان کا ہے اور اندر سے ایک چھوٹا سا راستہ ہے جو دونوں گھروں کو ملاتا ہے۔ بس وہ سیدھے اس راستے سے ہوتے ہوئے اندر چلے گئے۔ ریحان ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا،'' چچی ایک دم سے خاموش ہو گئیں۔ پھوپھی، ماں اور چچی کی چیخوں اور بچوں کی خوفزدہ ہو کر رونے کی آوازوں کے درمیان قاتلوں نے کمرے میں داخل ہو کر گولیوں کی باڑھ ماری۔ ''ریحان کے ہاتھ نماز کے لیے بندھے ہوئے تھے۔ سینے پہ بندھے ہاتھوں کے ساتھ کوئی آواز نکالے بغیر گر گیا۔ بائیس گولیاں نکلی تھیں جسم سے،'' وہ مجھے بتا رہی ہیں۔

''یہ سب کچھ منٹوں میں ہو گیا اور قاتل جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے واپس ہو گئے۔ دو کے منھ پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے اور ایک، جو درمیانی راستے پر جم کر کھڑا ہوا تھا، نقاب نہیں پہنے تھا،'' چچی نے بتایا۔

''شاید آپ اسے پہچان سکیں؟'' میں سوالیہ لہجے میں کہتی ہوں۔

''میں؟نہیں نہیں۔۔۔''وہ گھبرا سی گئیں۔''مجھے اس کی شکل بالکل یاد نہیں۔ہوش وحواس میں کہاں تھی تب۔''

''اگر پہچان بھی لیں تو کیا ریحان ہمیں واپس مل جائے گا؟ جانے والا تو گیا''پھوپھی جلدی سے بولیں۔

پھوپھی مجھے وہ کمرہ دکھانے لے جاتی ہیں جہاں وہ قتل ہوا تھا۔ یہ ایک بہت تنگ سا کمرہ ہے جس میں صرف ایک صوفہ سیٹ ہے جو تین دیواروں کے ساتھ لگا ہوا ہے۔صوفے کی وسطی میز کو چوتھی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھا گیا ہے اور کمرے کے وسط میں دری بچھی ہوئی ہے جس پر جاے نماز بچھائی جاسکتی ہے۔ چاروں دیواریں، اور صوفہ سیٹ گولیوں سے چھلنی ہیں۔میں صوفے پر بیٹھی ہوں۔ریحان کی چچی ہمارے لیے چاے لے کر آتی ہیں۔

ستائیس سالہ ریحان ایک بہن اور سات بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ریحان کے باپ تیرہ سال پہلے طویل بیماری کے بعد فوت ہوے۔ ریحان اس وقت آٹھویں میں تھا۔اس نے پڑھائی جاری رکھی اور لیاقت مارکیٹ میں اپنے ماموں کی دکان میں بطور سیلز مین کام شروع کیا۔بی کام کرنے کے بعد اس نے دوپٹوں کی دکان لگائی۔دو چھوٹے بھائی اس کی مدد سے جمعہ بازار میں اسٹال لگاتے۔پورے گھر کی ذمے داری اس پر تھی۔

''ریحان کے قتل کے بعد سب کچھ ختم ہوگیا۔بھائیوں نے تین ماہ سے جمعہ بازار میں اسٹال نہیں لگایا ہے۔ایک چھوٹے بھائی کی ذہنی حالت بگڑ گئی۔عجیب بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔پنڈی بھیج دیا تھا رشتے کے چچا کے پاس، لیکن کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔خلا میں تکتا رہتا ہے۔ہاتھ کھڑے کھڑے سینے پر باندھ لیتا ہے جیسے نماز پڑھ رہا ہو اور بڑبڑانے لگتا ہے: میرا بھائی ستائیس سال کا تھا۔اس کی شادی ہونے والی تھی۔اور پتا نہیں کیا کیا''پھوپھی کہہ رہی ہیں۔

''کیا ریحان کسی سیاسی پارٹی سے وابستہ تھا؟''

پھوپھی اور چچی خاموش ہوجاتی ہیں۔

''ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔آپ اس کی ماں سے بات کریں آکر۔وہ بتائیں گی سب۔''

ریحان کا تعلق ایم کیو ایم سے تھا، محلے کے لوگوں سے معلوم ہوا۔تین سال پہلے ریحان کو اغوا کرلیا گیا تھا۔ اٹھارہ دن بعد واپس آیا۔''ان دنوں اس نے ایک جگہ نوکری شروع کی تھی۔اغوا کے بعد اس نے ہمیں کبھی کچھ نہ بتایا۔ لیکن اس کے بعد سے مہینوں وہ دہشت زدہ رہا۔ہفتوں کھانا نہ کھا سکا۔نوالہ ہی نہیں نگلا جاتا تھا۔ایسا خوف، ایسی دہشت تھی کہ ہم نے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کی۔ماں اور پھوپھی کے بیچ میں لیٹ کر سوتا۔راتوں کو گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔بس کچھ نہ پوچھو کیسا کڑا وقت تھا۔لیکن ایک تسلّی تھی کہ زندہ سلامت تو ہے۔اب تو سب کچھ ختم ہوگیا۔یاد ہی رہ گئی۔''

ملیر، اے ون ایریا۔

دیواروں میں لکھے نعروں سے اندازہ ہوتا ہے یہاں ایم کیو ایم حقیقی کا راج ہے۔ ۱۹۷۰ء کے عشرے تک یہ علاقہ ایک کھلے وسیع میدان پر مشتمل تھا جس کے کنارے بیرکوں کی صرف ایک قطار تھی۔ یہ بیرکیں شیڈ کے نام سے مشہور تھیں۔ شیڈ کے آس پاس کچھ جھگیاں تھیں اور بھینسوں کے باڑے۔ یہاں پنجابیوں، سندھیوں اور مہاجروں کی ملی جلی آبادی تھی۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے اوائل میں یہ علاقہ دلاّلوں کے ہاتھ میں آیا جو علاقے میں جلد ہونے والی قانونی پلاٹنگ کے منتظر تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہاں کچے گھروں کی قطاریں کھڑی ہوگئیں۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی کے وسط میں ساٹھ مربع گز کے پلاٹوں کی حد بندی شروع ہوئی۔ شیڈوں کو منہدم کیا گیا اور پرانے مکینوں کو نئے پلاٹ الاٹ ہوے۔ لیکن اَن گنت پلاٹ دلالوں کے ذریعے کراچی کے دوسرے علاقوں سے آنے والے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کیے گئے اور یوں اے ون ایریا ۱۹۸۰ء کی دہائی کے تین خطرناک عناصر — ہتھیاروں، ہیروئن اور ایم کیو ایم — کی پناہ گاہ بن گیا۔ ۱۹۹۲ء کے وسط میں ہونے والے واقعات — آپریشن کلین اپ اور حقیقی کی پیدائش — نے بارود کا کام کیا۔

''ہم ملیر میں ۳۵ سال سے ہیں لیکن ایسے حالات نہیں دیکھے۔ یہ ایم کیو ایم کے دھڑے بندی تھی جس نے ہم سب کو برباد کیا۔ لالوکھیت، کورنگی اور دوسرے علاقوں سے ایم کیو ایم کے لڑکے چھپنے کے لیے یہاں اٹھ آئے۔ چھپنے چھپانے والوں نے ہمارے علاقے کا ستیاناس کیا۔ اب یہ لڑکے بندوقیں لٹکائے، گلیوں میں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ ڈاکے ڈالتے ہیں۔ بھتہ لیتے ہیں۔

''سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ ہے کہ یہاں انسانوں کی کوئی عزت نہیں رہی۔ ہماری گلی میں ایک بوڑھا، سفید کھچڑی بال، سبزی کا ٹھیلا لگاتا ہے۔ اسے ان لڑکوں سے التجا کرنی پڑتی ہے۔ ہاتھ باندھ کے وہ ان اٹھارہ اٹھارہ برس کے لڑکوں سے کہتا ہے: سرجی، پھیری لگالوں؟ ایک ہفتہ ہوا، ان لڑکوں نے پنساری کی دکان لوٹ لی۔ گلی کے بچوں میں لوٹی ہوئی ٹافیاں اور دو دو روپے تقسیم کیے اور کہا: بولو حقیقی زندہ باد۔ ہمارے دودھ والے نے میرے میاں کو بتایا کہ لڑکے اس سے دس ہزار مانگ رہے ہیں کہ اسلحہ خریدنا ہے۔ غریب دودھ والا دس ہزار کہاں سے لاتا۔ بے چارہ یہ علاقہ چھوڑ گیا۔ خدا جانے اب کہاں دودھ بیچتا ہوگا۔''

''تو یہ حال ہے ہمارے علاقے کا۔ یہ غنڈے بدمعاش جن کے منھ سے ابھی دودھ کی بو آتی ہے، نہ صرف یہ کہ بھتہ مانگتے ہیں بلکہ تمھارے منھ پر کہتے ہیں کہ اسلحہ ختم ہوگیا، بندوقیں لانی ہیں، گولیاں خریدنی ہیں،'' سکینہ، عمر پچپن کے لگ بھگ، مادری زبان پنجابی، سانس لیے بغیر بول رہی ہیں۔ تین سال کے عرصے میں سکینہ نے اس علاقے کا جو اخلاقی اور معاشرتی زوال دیکھا ہے، اس نے ان کا سر چکرا دیا ہے۔

میں ان کے گھر میں اپنی خالہ کے ساتھ ان کے بیٹے کا حال پوچھنے آئی ہوں جو گلی میں چلنے والی گولیوں سے شدید زخمی ہوا تھا۔ میری خالہ گورنمنٹ کے ایک محکمے سے وابستہ ہیں اور اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ اس علاقے میں رہتی ہیں۔

''اس دن بہت فائرنگ ہو رہی تھی۔ احمد نے ہم سب کو اندرونی کمرے میں جانے کو کہا اور برآمدے میں آیا کہ گیٹ بند کر لے۔ خدا جانے اس کے دل میں کیا سمائی کہ اس نے گیٹ ذرا سا کھول کر باہر جھانک لیا۔ ایک گولی اس کی دائیں آنکھ کے اوپر لگی اور وہیں گر پڑا۔ باہر لڑکوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں: احمد بھائی کے گولی لگ گئی، فائرنگ بند کرو، فائرنگ بند کرو! فائرنگ بند ہوگئی۔ چند لڑکے ہماری مدد کو آئے اور احمد کو جناح اسپتال پہنچایا گیا۔ دوسرے دن دو تین لڑکے میرے پاس آئے اور کہنے لگے: خالہ معاف کرنا، لیکن یہ ہماری گولی نہیں تھی جو احمد بھائی کو لگی۔ ذرا دیکھو ان کی ہمت۔ اور ہماری بے بسی! کیا کر سکتے تھے ہم؟ اگر وہ لڑکا بھی، جس کی بندوق سے چلی ہوئی گولی احمد کو لگی، ہمارے پاس آ جاتا تو ہم کیا بگاڑ سکتے تھے اس کا؟ کیسا زمانہ آ گیا۔ کوئی ظلم کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ اور اٹھائے بھی کیسے؟ کوئی دو لفظ بول دے تو جان سلامت نہیں،'' سکینہ کہہ رہی ہیں، ''ہر حال میں جیے جانے کی ہوس نے ہمیں کہیں کا نہ رکھا۔۔۔'' وہ چپ ہو جاتی ہیں۔

''جس دن میرے بھائی کو گولی لگی، جی چاہتا تھا پورے اے ون ایریا کو جلا کر راکھ کر دوں،'' احمد کی چھوٹی بہن کی آواز غصے سے کپکپاتی ہے۔ وہ بی اے پاس ہے اور ایک دوا ساز کمپنی میں کام کرتی ہے۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں سامنے دری پر بیٹھی مٹر کی پھلیاں چھیل رہی ہیں۔

یہ چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں۔ احمد سب سے بڑا ہے۔ دو بہنیں نوکری کرتی ہیں۔ باپ کبھی فوج میں سپاہی تھے۔ اب معمولی پنشن ملتی ہے۔ احمد ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ پھر اسے فیکٹری سے نکال دیا گیا۔ فیکٹری نقصان میں جا رہی تھی لہٰذا تیس آدمیوں کی چھٹی ہوئی۔ ''ایک دفعہ احمد نے باہر جانے کی کوشش کی۔ آٹھ ہزار مانگ تانگ کر کسی ایجنٹ کو دیے۔ لیکن یونان والوں نے پکڑ کر واپس بھیج دیا۔'' احمد دو سال سے بے روزگار ہے۔

میں خالہ کے ساتھ ملیر کے گلیوں سے گزر رہی ہوں۔ ''اس علاقے میں بہت اسلحہ ہے۔ چند ایک خالی گھر ہیں جہاں لڑکوں نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ یہ گھر اسلحہ ڈپو بنے ہوئے ہیں۔ کبھی ان گھروں کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اور قطار سے لگی ہوئی بندوقیں، کلاشنکوفیں اور گولیوں کی پیٹیاں ہر آنے جانے والے کو صاف نظر آتی ہیں۔ بندوقیں لٹکائے یہ لڑکے گولیوں کی پیٹیاں اِدھر سے اُدھر پہنچاتے رہتے ہیں۔ آج کل البتہ یہ لڑکے روپوش ہیں۔ جب سے دو امریکی مارے گئے ہیں، تب سے ذرا سکون ہے۔

''یہاں دو بدنام ترین لڑکے ہیں حقیقی کے۔ ایک کو تو پولیس گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ محلے والوں نے سکون کا سانس لیا کہ چلو ایک تو کم ہوا۔ لیکن ایک ہفتے بعد وہ لڑکا واپس گلیوں میں گھوم رہا تھا اور فخریہ انداز میں لوگوں کو بتا رہا تھا، دو لاکھ روپے دیے ہیں۔ ان لڑکوں نے کمسن بچوں کو تنخواہ پر رکھا ہوا ہے جو پولیس یا دوسرے گروپ کے لڑکوں کے آنے کی اطلاع انھیں وقت پر پہنچاتے رہتے ہیں۔ یہ بچے بڑے ہو کر کیا کر سکیں گے؟ ہمارے محلے میں الطاف گروپ سے کسی کو کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ لیکن حقیقی والے ان سے بھی بدتر ثابت ہوئے ہیں۔''

ہم ایک گھر میں داخل ہوتے ہیں جس کا سربراہ، ایک ادھیڑ عمر کا آدمی، پانچ بیٹوں اور پانچ بیٹیوں کا باپ، دو ماہ پہلے فائرنگ میں ہلاک ہوا ہے۔ بیوہ کسی کام سے باہر گئی ہوئی ہیں۔ میں لڑکیوں سے بات چیت کر رہی ہوں۔ سب سے بڑی لڑکی بیس سال کی ہے۔ ''اس دن ابا سہ پہر میں گلی کی نکڑ پر مکینک کی دکان سے اپنی اسکوٹر ٹھیک کروا رہے تھے کہ کچھ مسلح افراد گاڑی میں آئے اور گولیاں برسا کر چلے گئے۔ مکینک تو اسی وقت ختم ہو گیا۔ ابا زخمی حالت میں سڑک پر پڑے رہے۔ کوئی اٹھانے نہیں آیا۔ اتفاق سے میرے بھائی نے اس دن فیکٹری سے چھٹی کی تھی۔ جب گولیاں چلنی بند ہوئیں تو وہ باہر نکلا۔ دیکھا ابا سڑک پر پڑے ہوئے تھے۔ بہت خون بہہ گیا تھا۔ اسپتال جاتے وقت راستے میں ختم ہو گئے۔''

''میرے ابا اور بھائیوں کا کسی بھی پارٹی سے تعلق نہیں رہا، لیکن ابا کی موت کے بعد ایم کیو ایم اور حقیقی دونوں تنظیموں نے دعویٰ کیا کہ ابا ان کی پارٹی کے ہمدرد تھے۔ یہ جھوٹ تھا۔ بعد میں جب اخبار سے لوگ آئے تو بھائی نے کسی سے بات نہ کی۔ کیا فائدہ ان سب باتوں کا؟ الٹا نقصان ہی پہنچ سکتا ہے۔ ایک آدمی نے کہا میں دستاویزی فلم بنا رہا ہوں دنیا بھر میں دکھانے کے لیے کہ کتنا ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔ لیکن میرے بھائیوں نے منع کر دیا۔''

ہم چارپائی پر بیٹھے ہیں اور بچے ہمارے گرد گھیرا ڈالے کھڑے خاموشی سے ہماری باتیں سن رہے ہیں۔

''ابا موٹر سائیکل پر دکانوں کو مال سپلائی کیا کرتے تھے،'' وہ مجھے بتا رہی ہے۔ اب گیارہ افراد پر مشتمل اس خاندان میں دو کمانے والے ہیں۔

''جب بھی فائرنگ ہوتی تھی، ابا کہتے دروازہ بند کر لو، باہر نہ نکلو۔ بہت ڈرتے تھے۔ ہنگاموں سے دور رہتے تھے۔ دو دن پہلے ہی کہا تھا کہ کھڑکیوں دروازوں میں لوہے کی جالی لگوا لیں گے، بہت وارداتیں ہو رہی ہیں۔ کسی کو کیا معلوم تھا خود ہی واردات کا شکار ہو جائیں گے۔''

کیا حکومت کی طرف سے کوئی معاوضہ وغیرہ ملا؟ ''ہمیں صرف ایف آئی آر کی کاپی ملی جو پولیس نے خود درج کی تھی۔ اور ابا کی موت کا سرٹیفکیٹ جو اسپتال والوں نے دیا۔''

''لیاقت آباد میں بھی بہت برا حال ہے، جہاں میں رہتی ہوں۔لیکن یہاں کے حالات تو بہت ہی خراب ہیں،'' ایک بوڑھی خاتون جو گھر میں مہمان آئی ہیں، بتانے لگیں۔''دو مہینے پہلے میں یہاں آئی تھی۔بس سے اتر کر گلی میں داخل ہوئی۔ میری نظریں اتنی کمزور ہیں کہ میں صرف زمین کی جانب نظریں جمائے رکھتی ہوں کہ کسی پتھر سے ٹھوکر نہ کھاؤں۔ اِدھر اُدھر تو دیکھتی نہیں۔۔۔'' انھوں نے موٹے شیشوں والا چشمہ درست کیا اور بولیں،''میں جب گلی میں داخل ہوئی اور نظر اٹھائی تو دیکھا تین لڑکے یہ لمبی لمبی بندوقیں کندھوں پر لٹکائے کھڑے ہیں۔ میں وہیں بت بن گئی۔ مجھ سے اگلا قدم اٹھائے نہ اٹھے۔خوف تھا کہ ہلی اور ان لڑکوں نے گولی چلائی۔ایک لڑکے نے میرے سفید بالوں اور جھکی ہوئی کمر کو دیکھتے ہوئے کہا، اماں ڈر گئیں؟ میں بولی، بیٹا ڈروں کیسے نہیں؟ بندوق جو اٹھائے ہوئے ہو۔ بولا، اماں تم تو پہلے ہی مری ہوئی ہو۔تمھیں کیا ماریں!''

ہم تنگ گلیوں سے گزر کر خالہ کے گھر واپس لوٹتے ہیں۔''یہاں منشیات کا مسئلہ بھی ہے،'' خالہ کہتی ہیں۔ایک مکان کے باہر بنے ہوئے چبوترے پر ایک آدمی بیٹھا ہے— سرخ آنکھیں، گالوں کی ہڈیاں نکلی ہوئی، خالی الذہن، خلا میں گھورتا ہوا۔

''کچھ لوگ کھلم کھلا بیچتے ہیں ہیروئن۔ایک پکڑا بھی گیا تھا۔لیکن چھوٹ کے آ گیا۔اس کا بھائی وکیل ہے۔''

میری خالہ کو حالات سے باخبر رہنا پڑتا ہے۔ان کے بچے چھوٹے ہیں اور اسکولوں کالجوں میں پڑھ رہے ہیں۔ بڑی بیٹی کراچی یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔دو لڑکوں نے تکنیکی ڈپلومے لیے ہیں اور اب ٹیکسٹائل ڈیزائن کا کام شروع کیا ہے۔خالہ کی زندگی جدوجہد کی داستان ہے۔خالو کی مسلسل بیماری کی وجہ سے گھر بار کا پورا بوجھ ہمیشہ خالہ پر ہی رہا۔

''اور اب میں سوچنے لگی تھی کہ چلو بچوں کی تعلیم ختم ہونے کو آ رہی ہے اور وہ برسرِ روزگار ہونے لگے ہیں۔سکون سے بقیہ دن گزر سکیں گے۔لیکن اب یہ گھر ہے، اور ہم۔۔۔'' خالہ ہرے بھرے گملوں پر نظر ڈالتی ہیں۔ برآمدے میں سیمنٹ کی چادر ڈلوا کر لوہے کی جالی لگوائی ہے۔سفید پینٹ تازہ ہے۔''اور یہ محلہ۔۔۔ جو تیزی سے تباہی کے گڑھے میں گر رہا ہے۔کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے میں دلدل پہ چل رہی ہوں۔بس ایک تسلی ہے، اگر اسے تسلی کہہ لو، کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ہم سب ہی اس دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں۔شاید آگے دلدل ختم ہو جائے اور زمین مضبوط، کون جانے۔۔۔'' خالہ کے چہرے پہ ایک موہوم سی مسکراہٹ ہے۔

❄

کورنگی کی کہانی

صبح کے نو بجے ہیں۔ وسط مارچ کے سورج کی چمکیلی کرنیں فضا کو آہستہ آہستہ گرما رہی ہیں۔ میں پل پر سے ہوتی ہوئی کورنگی انڈسٹریل ایریا سے گزر رہی ہوں۔ دورویہ چوڑی سڑک کے دونوں اطراف ملیں اور فیکٹریاں ہیں۔ کراچی کے سائٹ ایریا کے برخلاف، جہاں غیر ملکی کمپنیوں نے فیکٹریوں کے اردگرد پیڑ پودے، گل بوٹے لگا کر علاقے کو سرسبز کر دیا ہے، کورنگی انڈسٹریل ایریا بنجر اور خاک آلود ہے۔ یہاں دو چار ہی غیر ملکی کمپنیوں کے پلانٹ ہوں گے۔ اکثریت مقامی کارخانوں کی ہے۔ فیکٹریوں کے باہر کہیں کہیں گھاس کے قطعے ہیں اور پودوں کی دو چار قطاریں نظر آتی ہیں، گویا کسی نے بادلِ ناخواستہ کوشش کی ہو اس علاقے کو خوش نما بنانے کی، اور پھر پھولوں کی کیاریوں کو تنہا چھوڑ گیا ہو۔

واقعی کورنگی اب ویران اور تنہا رہ گیا ہے۔

تنہا اور زخم خوردہ۔ خوف و دہشت اور نفرت و جنوں کے جال میں الجھا ہوا۔

کراچی کے غیر متاثرہ علاقوں کے مکینوں کے لیے کورنگی، جو کبھی شہر کا ایک پھلتا پھولتا، پرامن علاقہ تھا، آج اخبار کی صرف ایک کالمی روزانہ سرخی میں سمٹ کر گم ہو گیا ہے: ''گولیوں سے چھلنی ایک لاش کورنگی میں پائی گئی۔''

ٹریفک کم ہے۔ دور دور تک کوئی پیدل چلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ ایک پیلی ٹیکسی سڑک کے کنارے رکتی ہے اور ایک مرد چشمہ لگائے، پینٹ اور ٹائی میں ملبوس، بریف کیس ہاتھ میں لیے، ٹیکسی سے اترتا ہے اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا فیکٹری کے گیٹ کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ میں گاڑی روکتی ہوں اور ٹیکسی ڈرائیور سے راستہ پوچھتی ہوں۔ ''تیسرے چوراہے پر دائیں ہاتھ کو مڑیں۔ وہی ڈھائی نمبر کورنگی ہے۔'' میں گاڑی اسٹارٹ کرتی ہوں۔

یہ کورنگی کا رہائشی علاقہ ہے۔ سڑک پر جا بجا گڑھے ہیں۔ ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھ پر لوگ چل رہے ہیں۔ کہیں کہیں بس کے انتظار میں لوگ کھڑے ہیں۔ سڑک کے وسط میں بنی سبز پٹی کیچڑ اور کوڑے کرکٹ سے اٹی ہوئی ہے۔ بچے کھیل رہے ہیں۔ میں گاڑی آہستہ کرتی ہوں اور لوگوں سے پتا پوچھتی ہوئی آگے بڑھتی ہوں۔ ایک مرد، ایک لڑکا اور دو برقع پوش عورتیں باری باری مجھے پتا سمجھاتی ہیں۔ میں اب بائیں ہاتھ کی سڑک پکڑتی ہوں۔ سڑک کے ایک طرف کیکر کی جھاڑیاں ہیں اور دوسری طرف ٹریفک: ایک سائیکل، ایک گدھا گاڑی اور ایک ٹیکسی۔

کورنگی ٹاؤن شپ کی بنیاد یونانی مشیروں کے تیار کردہ گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان کے تحت ۱۹۵۹ء میں کیے گئے ایک سروے کے بعد ڈالی گئی تھی۔ اس وقت کراچی میں ایک لاکھ انیس ہزار بے گھر خاندان تھے جو شہر کے مرکز میں جھونپڑیوں اور کچے گھروں میں رہ رہے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ وسطی شہر کو جھگیوں سے صاف کیا جائے اور ان خاندانوں کو شہر کے مرکز سے اٹھا کر پندرہ میل پرے کورنگی اور نیو کراچی میں آباد کیا جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ حکومت

ایک کمرے والے ۴۵ ہزار مکانات بنائے گی۔ لیکن ۱۹۶۴ء تک صرف دس ہزار مکانات بنے تھے اور یہ منصوبہ ناکام قرار پا کر سرد خانے کی نذر ہو چکا تھا۔ کورنگی میں رہائشی کالونی کے ساتھ ساتھ انڈسٹریل ایریا کی بھی داغ بیل ڈالی گئی تھی تا کہ کورنگی کے مکینوں کو روزگار کے لیے شہر نہ آنا پڑے۔ لیکن انڈسٹریل ایریا میں کارخانے اتنی تیزی سے نہ لگ پائے۔ یہ بستی پینتیس سال پرانی ہے۔

میں شمشاد بھائی کا گھر تلاش کرتی ہوں۔ ان کا گھرانہ بیس سال سے کورنگی میں مقیم ہے۔ ان کی بیوی شکیلہ سے میں نے فون پر بات کی ہے اور انھوں نے مجھے کورنگی کے دو چار متاثرہ خاندانوں میں لے جانے کی ہامی بھری ہے۔ یہ وہ خاندان ہیں جو کراچی کے حالیہ پُرتشدد واقعات سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں۔

شمشاد بھائی کراچی کے مختلف علاقوں کے مکانوں میں رنگائی کا کام کرتے ہیں اور عام طور پر گھر رات ہی کو پہنچ پاتے ہیں۔ ان کے نو بچے ہیں: تین لڑکے اور چھ لڑکیاں۔ سب سے بڑا لڑکا ۲۳ سال کا ہے اور نیوی میں ملازمت کرتا ہے۔ انیس سالہ علی گھر کے قریب کرائے پر لی ہوئی کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے۔ نویں جماعت کے بعد اس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے۔

میں شکیلہ سے باتیں کرتی ہوں۔ ہم علی کے دوست نعمان کا انتظار کر رہے ہیں جو ہمیں ایک خاتون کے پاس لے جانے والا ہے جس کا انیس سالہ بیٹا دہشت گردوں کے ہاتھوں بیس دن پہلے قتل ہوا ہے۔

شکیلہ کی بیٹی نے دالان کی ابھی ابھی دھلائی کی ہے۔ دوسری بیٹی کمروں کے فرش پر پوچھا لگا رہی ہے۔ یہ تین کمروں والا ۸۰ مربع گز پر بنا مکان ہے۔ گیٹ کے چھوٹے دروازے کا پٹ تھوڑا سا کھلا ہوا ہے۔

''دوسرے علاقے کے لوگوں کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ ہم یہاں کیسی زندگی گزار رہے ہیں۔ مسلسل خوف، فکر و اندیشے اور ذہنی تناؤ نے ہماری زندگی کو جہنم بنا دیا ہے،'' وہ کہہ رہی ہیں۔ ان کی آٹھ سالہ بیٹی محاصرے کی رات کے بعد بخار میں ہفتوں پھنکتی رہی۔ ''پلنگ سے لگ گئی تھی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو کانوں میں انگلیاں دیے رہنے لگی۔ ذرا سی آواز پر پلنگ کے نیچے چھپ جاتی، ہر وقت میرا دامن پکڑے رہتی۔ ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو اس نے کہا: بچی کے دل میں ڈر بیٹھ گیا ہے۔''

میں بچی کو دیکھتی ہوں — دبلی پتلی، آنکھوں کے گرد حلقے، اور ہلکی سی سرخی۔ لگتا ہے بہت دنوں تک روتی رہی ہے۔

''میرا بیٹا جو کریانے کی دکان پر بیٹھتا ہے، خاموش رہنے لگا ہے۔ بہت خوش مزاج بچہ تھا۔ ہمیشہ چہکتا رہتا تھا۔ اب تو چپ لگ گئی ہے۔ لیکن یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میری بڑی بہن کا گھرانہ بے حد پریشان ہے۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا

اسپتال میں نفسیاتی ڈاکٹر کے زیرِ علاج ہے۔''

شکیلہ کی بڑی بہن پڑوس میں رہتی ہیں۔ ہم ان کے گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ چھوٹے سے دالان کو ابھی پانی سے دھویا گیا ہے۔ غالباً کورنگی میں پانی کی قلت نہیں ہے، میں سوچتی ہوں اور خاتونِ خانہ سے ہاتھ ملاتی ہوں۔

''ایک شام دیکھا، ننگے پیر گھر چلا آ رہا ہے۔ پیر مٹی میں اٹے ہوئے، خراشیں پڑی ہوئیں۔ پوچھا، جوتے کہاں گئے۔ کہنے لگا، امی، فقیر کو دے دیے۔ دوسرے دن گھڑی اتار کر کسی کو دے آیا۔ اپنے کپڑے بانٹنے شروع کر دیے۔ کہتا تھا، غریبوں کو دے رہا ہوں، سکون ملتا ہے مجھے۔ پھر گھر کی چیزیں اٹھا اٹھا کر دینے لگا۔ برتن بھانڈے، ٹیپ ریکارڈر، بہن بھائیوں کے کپڑے، جوتے۔۔۔'' سراج کی ماں مجھے دھیمے لہجے میں بتا رہی ہیں۔ سفید اور سرمئی بال ململ کے دوپٹے سے ڈھکے ہوے، اندر کو دھنسی ہوئی بے رونق شربتی آنکھیں، جو گہرے حلقوں کے باعث گول اور مزید نمایاں ہوگئی ہیں۔ رخسار کی ہڈیاں نکلی ہوئی، چہرے پر باریک باریک لکیروں کا جال بچھا ہوا کرب اور دکھ اور گزرے ہوے برسوں کا جال۔ ساٹھ برس کی ہوں گی لیکن ستر پچھتر کی لگ رہی ہیں۔

''پہلے تو میں سمجھا شاید تکبر آ گیا ہے لڑکے میں۔ انا پیدا ہوگئی ہے اس کے اندر۔ کیونکہ میں کچھ سمجھانے کی کوشش کرتا تو میری بات کاٹ دیتا۔ زور زور سے بولنے لگا تھا،'' سفید شلوار کرتے میں ملبوس، گھٹے ہوے بالوں پر سفید ٹوپی اوڑھے ہوے، خشخشی ڈاڑھی والے بزرگ، سراج کے والد، کہہ رہے ہیں۔

''تو کیا گھر میں توڑ پھوڑ بھی۔۔۔'' میں نے پوچھنا چاہا۔

''نہیں، ایسی بات نہیں تھی۔ توڑ پھوڑ نہیں کی کبھی اس نے،'' انھوں نے بتایا۔

''آفس جانا تو چھوڑ دیا ہوگا،'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔

''آفس وہ برابر جاتا رہا۔ لیکن وہاں بھی یہی باتیں شروع کر دی تھیں: امن چاہیے، سکون چاہیے۔ بس ایک ہی رٹ لگ گئی تھی۔ امن چاہیے، امن چاہیے،'' سراج کی اماں بتا رہی ہیں۔

''دراصل لاشیں دیکھ دیکھ کر اسے کچھ ہوگیا تھا۔ ندی کے راستے اسکوٹر پر آفس آتا جاتا تھا نا۔ روز شام مجھے آ کر بتاتا: امی، آج ایک لاش پڑی ہوئی تھی، گولیوں سے چھلنی، چہرہ اڑا ہوا۔ کیسے تڑپ تڑپ کر جان دی ہوگی۔ اور پھر جب محاصرہ ہوا۔ علاقے کے تمام لڑکوں اور مردوں کو فوجی لے گئے۔ اس کو بھی لے گئے۔ حالانکہ اس نے اپنا پی اے ایف کا کارڈ دکھایا تھا۔ چھوڑ تو اسی دن دیا، لیکن اس کے بعد سے ہی اس نے الٹی سیدھی باتیں کرنا شروع کر دیں اور گھر کا سامان باہر لے جا کر بانٹنے لگا۔''

''دس بارہ ہزار کا سامان بانٹ دیا۔ چھوٹا سا گھر بار ہے ہمارا۔ یہاں ہر چیز ضرورت ہی کی خریدی جاتی ہے۔

بے ضرورت چیزیں تو ہیں نہیں کہ بانٹنا شروع کر دیں اور کوئی فرق نہ پڑے۔ دس بارہ ہزار کا سامان بانٹ ڈالا اس نے،'' بزرگ نے دہرایا۔ سراج کی اماں نے پہلو بدلا۔ شاید وہ سامان کی مالیت کے بارے میں کچھ سننا نہیں چاہتیں۔

میں سوچتی ہوں: اس چھوٹے سے گھر کے مکینوں پر ان دنوں کیا بیتی ہوگی؟ گھر کے باہر قتل و غارت گری، دہشت گردی کی فضا، ایم کیو ایم الطاف گروپ، حقیقی، پولیس اور رینجرز کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑیں، پولیس اور نامعلوم دہشت گردوں کے آپس میں مسلح مقابلے، گلیوں میں موت کے سائے۔ اور پھر محاصرے کی پیدا کردہ دہشت: گھروں کے اندر فوجیوں کا دندناتے ہوئے گھسنا، گھر کی چیزوں کو تہس نہس کرنا، الماریوں، صندوقوں کا سامان باہر پھینکنا— ان ہتھیاروں کی تلاش میں جو وہاں نہیں ہیں، مکینوں کی فکر اور تشویش: اگر بیٹے کو اٹھا کر لے گئے تو کیا ہوگا؟ کیا کریں گے؟ کس کے پاس فریاد لے کر جائیں گے؟ کیسے یقین دلائیں گے کہ اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں؟ کیسے اس کی بے گناہی ثابت کریں گے؟ نہ کسی صاحبِ اختیار کی سفارش ہے اور نہ جیب میں رقم۔ اگر لے گئے تو اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ زندہ واپس آئے گا کہ نہیں؟ اور گھر میں سب سے بڑے کماؤ پوت کی بہکی بہکی باتیں، گھر کی اشیا کو غریبوں میں تقسیم کرنا، باپ کی سرزنش، بیٹے کی اونچی ہوتی ہوئی آواز، چھوٹے بہن بھائیوں کا سہم کر دبکنا اور ماں کی سرگوشیاں: ''جانے دیں۔۔۔ چھوڑیں بھی۔۔۔ غریبوں ہی کو تو دے رہا ہے، کوئی گناہ تو نہیں کر رہا۔۔۔''

''دس بارہ دن بعد مجھے احساس ہوا کہ اس کی ذہنی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اسپتال لے گیا اسے۔ ایرفورس کا اسپتال۔ ماری پور میں ہے۔ ڈاکٹر نے پوچھا، کیا چاہتے ہو؟ اس نے کہا، میں امن چاہتا ہوں، صرف امن۔ ڈاکٹر نے سوال کیا، امن کیسے قائم کیا جائے؟ بندوق سے؟ کلاشنکوف سے؟ اس نے کہا، نہیں۔ صرف پیار محبت سے۔ ڈاکٹر نے کہا، اسے داخل کرنا پڑے گا۔''

سراج کو اسپتال میں داخل ہوئے ڈھائی ماہ ہو چکے ہیں۔

سراج کی عمر ۲۵ سال ہے۔ گزشتہ سات سال سے پاکستان ایرفورس میں ملازمت کر رہا ہے۔ ''کاغذ پر اس کی نوکری انجن مکینک کی لکھی ہے،'' والد نے میرے دریافت کرنے پر بتایا۔ ''لیکن وہ آفس میں کام کرتا ہے،'' انھوں نے آفس پر زور دے کر کہا۔

''بی اے پارٹ ون کا امتحان پاس کر چکے ہیں۔ کمپیوٹر کورس بھی کیا ہوا ہے بھیا نے،'' چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے سولہ سالہ چھوٹی بہن بولی۔ چمکتی ہوئی شربتی آنکھیں، ناک میں لونگ، گالوں پر مہاسے، سر پر قرمزی چنری۔ وہ ماں کے پہلو سے لگی چارپائی پر بیٹھی ہوئی ہے اور والد صوفے کے دوسرے کنارے پر۔ کمرے کی دیواریں سبز ہیں۔ فرج کونے میں رکھا ہے، ٹی وی سامنے اور ٹیلی فون تپائی پر دھرا ہے۔

بی اے کا امتحان کیا ملازمت کے دوران دیا؟''ہاں، بڑا محنتی اور ذہین لڑکا ہے۔ ایرفورس کے کچھ تکنیکی کورسز بھی کر چکا ہے۔'' والد کے چہرے پر ٹھیراؤ کی کیفیت ہے۔ لکیروں کا جال ابھی اتنا گہرا نہیں ہوا ہے۔

سراج کے ماں باپ ۱۹۴۹ء میں پاکستان آئے تھے۔ ابتدا میں کراچی ایرپورٹ کے قریب جھگیوں میں رہے، پھر ملیر اٹھ آئے۔''۱۹۷۵ء میں ہم نے ایک چھوٹا سا پلاٹ خریدا اور یہاں مکان بنوایا۔ اس زمانے میں کورنگی میں امن وامان تھا۔ ۱۹۸۵ء کے بعد ایم کیو ایم یہاں بے حد مقبول ہوگئی۔ لیکن اس وقت بھی سکون تھا۔ لڑائی جھگڑے والی کوئی بات نہیں ہوتی تھی۔ یہ حال تو صرف ایم کیو ایم کے دو دھڑے بننے کے بعد ہوا، جب حقیقی بنی۔ ڈھائی تین سال پہلے کی بات ہے۔ عزیز آباد، نائن زیرو کے بعد ایم کیو ایم الطاف گروپ کا سب سے بڑا مرکز کورنگی ہے۔ ایم کیو ایم اور حقیقی دونوں کے لڑکے اتنے منجھے ہوئے ہیں کہ وہ کارروائی کے بعد فوراً غائب ہوجاتے ہیں اور بے گناہوں کی شامت آتی ہے، پولیس اور رینجرز والوں کے ہاتھوں،'' وہ کہہ رہے ہیں۔

''جب فوجی ہمارے گھر کی تلاشی لینے آئے تو میں نے کہا، جو لینا ہو صندوق سے نکال لو۔ پھر میں نے پوچھا، کب سے ڈیوٹی پر ہو؟ تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ آرام کرو۔ چائے بنوا کے دی۔ ہمارے کچھ رشتے دار پنڈی، ملتان اور لاہور میں شروع سے آباد ہیں۔ پنجاب آتا جاتا رہتا ہوں، اس لیے پنجابی آتی ہے۔ ایک فوجی نے پوچھا، چاچا، کہاں کے رہنے والے ہو؟ میں نے کہا، لاہور کا رہنے والا ہوں۔ انھوں نے گھر کا کوئی سامان نہ چھوا اور خاموشی سے نکل گئے۔'' سراج کے والد کی مسکراہٹ میں تلخی ہے۔

سراج کی طبیعت اب سنبھل چلی ہے۔ وہ کراچی کے حالات سے باخبر رہتا ہے۔ اسپتال میں باقاعدگی سے اخبار پڑھتا ہے، ٹی وی دیکھتا ہے۔ لیکن اب اس کی امن امن کی رٹ ختم ہوچکی ہے۔''اب وہ سیٹ ہوگیا ہے۔ لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں دوائیوں کا کورس پورا ہوجائے تب چھٹی ملے گی۔ عید پر آیا تھا پانچ دنوں کے لیے،'' والد بتا رہے ہیں۔

ہم شکیلہ کے گھر واپس آتے ہیں۔ لڑکے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ نعمان اپنے ساتھ انور کو لے کر آیا ہے۔ انور کی عمر چھبیس ستائیس سال ہے لیکن پینتیس کا نظر آتا ہے — سنولایا ہوا سنجیدہ چہرہ، سوچ میں ڈوبی آنکھیں۔ وہ خاموش ہے۔ انور ایم کیو ایم کا کارکن ہے۔

''یہ اس لڑکے کا ماموں ہے جس کا قتل ہوا تھا۔ قاتل اس کی تلاش میں آئے تھے۔ اس وقت یہ وہاں نہیں تھا۔ انھوں نے بھانجے کو مار دیا،'' شکیلہ مجھے سرگوشی میں بتاتی ہیں۔''یہ اپنی بہن کے گھر سوئم کے بعد سے نہیں گیا ہے۔ کہتا ہے، آپا کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ روتا ہے کہ میں اس دن وہاں کیوں نہ ہوا۔ موجود ہوتا تو مجھے قتل کرتے، بھانجا زندہ ہوتا۔''

میں گاڑی کھڑی کرتی ہوں۔ گھر کے سامنے میدان ہے۔ غالباً یہ چوڑی، دورویہ سڑک کی جگہ ہے جو اب معلوم نہیں کتنے برس بعد بنے گی۔ فی الوقت کورنگی میں بلدیاتی اداروں کی جانب سے کوئی ترقیاتی کام ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ سڑک کے ایک کنارے کیکر کی گھنی جھاڑیاں ہیں اور دوسری جانب ساٹھ مربع گز پر بنے مکانات کی ایک سنسان قطار۔ گھروں کے دروازے بند ہیں۔ دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دیتا، گو کہ گیارہ بجے کے آس پاس کا وقت ہے۔ گھر کے تھوڑا آگے جھاڑیوں کو کاٹ کر میدان صاف کیا گیا ہے اور ایک باڑا نظر آرہا ہے۔ بھینسیں جگالی کر رہی ہیں اور فضا میں گوبر، چارے اور دودھ کی ملی جلی مہک بسی ہوئی ہے۔

انور اپنی بہن کے دروازے پر دستک دیتا ہے اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ ایک بوڑھا آدمی دروازہ کھولتا ہے۔ میں اور شکیلہ اندر داخل ہوتے ہیں۔ لڑکے باہر ہی کھڑے ہیں۔

ہم صوفے پر بیٹھے ہیں۔ کمرہ چھوٹا ہے اور فرش پر دری بچھی ہوئی ہے۔ مقتول لڑکے کی ماں ایک بھاری بدن کی عورت ہیں، چالیس کے پیٹے میں۔ ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی ہیں۔ وہ کمرے کا سامنے والا دروازہ، جس پر ایک موٹا سیاہ تالا لٹکا ہوا ہے، کھولتی ہیں۔ کمرہ سورج کی تیز چبھتی ہوئی روشنی سے اچانک بھر جاتا ہے۔ وہ میرے برابر آبیٹھتی ہیں۔ ''ایک وقت تھا ہم سب رات کو یہ دروازہ کھول کر اس کمرے میں سویا کرتے تھے۔ اتنا امن وامان تھا کورنگی میں۔ اب تو یہ موٹا تالا اندر سے دن رات لگائے رہتی ہوں۔'' پھر وہ اس بھیانک صبح کا نقشہ کھینچتی ہیں جس کی یاد زندگی بھر ان کو کچوکے دیتی رہے گی۔

''صبح کے سات بجے ہوں گے جب کسی نے دستک دی۔ میں پراٹھوں کے لیے آٹا گوندھنے کے بعد ہاتھ دھو رہی تھی۔ میں نے پوچھا، کون ہے؟ آواز آئی، انور ہے؟ میں سمجھی انور کا کوئی دوست ہوگا۔ کبھی میرا بھائی میرے گھر ہی رات رہ جاتا ہے۔ اماں قریب ہی رہتی ہیں۔ لیکن اس صبح انور نہیں تھا۔ اچھا، منو کو بھیج دو، کیسٹ کا پوچھنا ہے، آواز آئی۔ میرے بیٹے نے حال ہی میں وڈیو کیسٹ کی دکان سیٹ کی تھی۔

''اس صبح منو کی آنکھ آواز سے فوراً کھل گئی۔ عام طور پر وہ دیر تک سوتا تھا اور اٹھائے نہیں اٹھتا تھا۔ اتنی گہری نیند ہوتی تھی اس کی۔ لیکن اس دن قضا جو آئی تھی۔ آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا۔ بنیان پہنے ہوے تھا، قمیص اٹھائی اور باہر نکل آیا۔ اماں ابھی آتا ہوں۔ اس آدمی نے غالباً اس سے کچھ کہا اور منو اس کے پیچھے چلا گیا۔ اور پھر مجھے گولیوں کی باڑھ کی دل دہلانے والی آواز آئی۔ میں سمجھی دوبارہ محاصرہ ہو گیا ہے۔ میں باہر بھاگی کہ منو سے کہوں فوراً اندر آجائے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان گولیوں کا نشانہ میرا بیٹا ہی بنا ہے۔ جب میں نے دیکھا تو بچہ زمین پر پڑا ہوا تھا۔ گولیوں نے اس کے چہرے اور ٹانگوں کو چھلنی کر دیا تھا۔ آج تک محلے والوں نے میرے ناخن تک نہ دیکھے تھے لیکن اس وقت

مجھے اپنا ہوش نہ تھا۔ بس اس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور ختم۔

''اتنا معصوم تھا میرا بچہ۔ ہر ایک سے محبت کرنے والا۔ محلے والوں کے کام کرتا۔ سب کا لاڈلا تھا۔ خدا معلوم اسے کیوں مار ڈالا۔ تین سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہوا تھا۔ بڑا عرصہ بیمار رہے۔ منو اس وقت نویں جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ باپ کے مرنے پر مجھ سے کہتا تھا، اماں تم فکر نہ کرو، بس اب میں گھر چلاؤں گا۔ پڑھائی چھوڑ دی اور اِدھر اُدھر چھوٹا موٹا کام کیا۔ جب مستقل روزگار نہ لگا تو بولا، اماں میرا حصہ دے دو۔ چند سالوں میں تمھیں یہ روپیہ واپس لوٹا دوں گا۔ اُن کے پراویڈنٹ فنڈ کے تیس ہزار پڑے تھے میرے پاس۔ اس نے ایک وڈیو کیسٹ کی دکان لگائی تھی ایک ماہ پہلے۔''

میں اٹھ کر منو کی سولہ سالہ بہن سے ملنے اندر جاتی ہوں۔ سر پر دوپٹہ، جذبات سے عاری، ساکت چہرہ۔ ''اس کو سکتہ ہو گیا تھا بھائی کی موت پر۔ نویں میں پڑھ رہی تھی۔ اسکول چھوڑ دیا ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا ساتویں میں پڑھ رہا تھا، وہ بھی اسکول سے اٹھ گیا ہے۔ وڈیو کی دکان میں بیٹھتا ہے۔ کہتا ہے آگے نہیں پڑھے گا۔ پندرہ سو پنشن کے ملتے ہیں۔ میں نے والد صاحب کو گھر بلا لیا ہے تاکہ بچوں پر نظر رکھیں، گھر سے باہر نہ نکلنے دیں۔''

کورنگی جیسے علاقوں میں اسکول بیچ میں چھوڑ دینے والے بچوں کی تعداد شہر کے دوسرے علاقوں کی نسبت ویسے ہی زیادہ ہے۔ آٹھویں کے بعد والدین عام طور پر لڑکیوں کو اٹھا لیتے ہیں کیونکہ وہ تمام بچوں کے اسکول کے اخراجات کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بعض گھروں میں اس عمر میں لڑکوں کو روزگار پر بٹھانا لازمی ہو جاتا ہے یا پھر لڑکے پڑھائی میں عدم دلچسپی کی وجہ سے خود ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ کراچی کے بگڑتے ہوئے حالات کی وجہ سے اسکول چھوڑنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان علاقوں کے اسکول فائرنگ اور تشدد کے واقعات کی وجہ سے آئے دن بند رہتے ہیں۔

ہم گھر سے باہر آتے ہیں۔ لڑکے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔ انور ہمیں خدا حافظ کر کے چلا جاتا ہے۔ شکیلہ کا بیٹا اور اس کا دوست ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہیں۔ ''وہ لوگ سمجھ رہے تھے یہ جماعت اسلامی والوں کی گاڑی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جماعت اسلامی کا آدمی آیا تھا، فیچر لکھنے۔ لیکن جب اس کا مضمون آیا تو صرف جماعت کی تعریفوں سے بھرا ہوا تھا۔ جماعت نے کورنگی میں یہ کیا، جماعت نے وہ کیا۔۔۔'' وہ بڑبڑا رہا تھا۔ تو جماعت اسلامی کورنگی میں موجود ہے؟ میرا خیال تھا یہ صرف اور صرف ایم کیو ایم کا علاقہ ہے۔

ہم شکیلہ کے گھر واپس لوٹتے ہیں۔ ''ہمیں پیغام ملا ہے کہ ہم آپ کو کسی اور گھر نہ لے جائیں۔ یہ پیغام کل رات سیکٹر آفس میں آ گیا تھا لیکن مجھ تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ وہ کہتے ہیں آپ کو نائن زیرو سے اجازت لینی ہوگی،'' نعمان کہہ رہا

ہے۔

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں: میں نے آنے سے پہلے شکیلہ کو فون کیا تھا۔ شکیلہ نے اپنے بیٹے علی سے تذکرہ کیا ہوگا اور اس نے اپنے دوست نعمان کو بتایا ہوگا۔ نعمان ایم کیو ایم کا کارکن ہے۔ نعمان نے انور سے رابطہ کیا ہوگا جو ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے اور بتایا ہوگا کہ میں فیچر کے لیے آ رہی ہوں، ان خاندانوں کے بارے میں جو دہشت گردی سے براہ راست متاثر ہوئے ہیں۔ انور نے یونٹ انچارج سے بات کی ہوگی جس نے سیکٹر انچارج سے رابطہ کیا ہوگا اور وہاں سے نائن زیرو فون کیا گیا ہوگا۔ اور نائن زیرو نے اجازت نہ دی ہوگی۔

لیکن یہ پیغام اس وقت پہنچا جب میں منو کی اماں سے باتیں کر رہی تھی۔

''میں کوئی سیاسی نوعیت کا مضمون نہیں لکھ رہی ہوں۔ میں صرف متاثرہ خاندانوں کی عورتوں سے باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ کون کس پارٹی سے منسلک ہے،'' میں اس لڑکے کو سمجھانے کی بے سود کوشش کرتی ہوں۔

''تو کیا تم مجھے ان خاندانوں سے بھی ملنے نہ دو گے جن کا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، میرا خیال ہے یہ مشکل ہوگا۔'' وہ کچھ سوچتا ہے۔ ''اچھا، میں مقصود بھائی کو پیج (page) کرتا ہوں۔'' میں دوسرے کمرے میں شکیلہ کی بیٹیوں سے باتوں میں مصروف ہو جاتی ہوں اور نعمان فون کے پاس بیٹھ کر پیجر کے پیغام کا انتظار کرتا ہے۔ دن چڑھتا جا رہا ہے، اور میری بے صبری بڑھ رہی ہے۔ ''آپ ٹھہریں، میں سیکٹر والوں سے بات کرتا ہوں۔'' وہ باہر جاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد واپس آتا ہے۔ ''ٹھیک ہے۔ آپ میرے ساتھ آئیں۔'' باہر ایک لڑکا کھڑا ہے۔ تیس کے لگ بھگ ہوگا۔ وہ میرا نام پوچھتا ہے۔ میں رسالے کا ایک شمارہ اسے دیتی ہوں۔ وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے، دو چار ورق الٹتا ہے اور مجھے واپس کر دیتا ہے۔ ''میرے ساتھ آئیے،'' وہ کہتا ہے۔ ہم تینوں چلتے ہیں۔ گلی کے اختتام پر ایک میدان ہے۔ میدان پار کرنے کے بعد ہم دائیں مڑتے ہیں اور پھر بائیں گلی کے کنارے پہنچتے ہیں۔ وہ آدمی کہتا ہے، ''آپ یہیں رہیں۔ آفس میں لوگ بیٹھے ہیں۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گلی سے نکل کر غائب ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک موٹا تازہ، چوڑا چکلا آدمی نمودار ہوتا ہے۔ یہ چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ میں اپنی کہانی دہراتی ہوں۔ ''میں عزیز آباد بھی جانا چاہتی ہوں،'' میں ٹکڑا لگاتی ہوں۔ ''آپ کو مرکز سے اجازت لینا ہوگی۔ پھر آپ کو ہر گھر میں لے جایا جا سکتا ہے۔ کورنگی ہو یا عزیز آباد۔'' وہ رسالہ ہاتھ میں لیتا ہے اور ایک نظر ڈال کر واپس کر دیتا ہے۔ پھر دونوں آدمی گلی سے نکل کر غائب ہو جاتے ہیں اور میں نعمان کے ساتھ واپس چل پڑتی ہوں۔ جس گھر کی دیوار کے ساتھ ہم لوگ کھڑے باتیں کر رہے تھے اس کا دروازہ کھلتا ہے اور دو عورتیں سر نکال کر باہر جھانکتی

ہیں۔ میں انھیں دیکھ کر مسکراتی ہوں۔ جواب میں وہ بھی مسکراتی ہیں۔ شاید یہ دیوار سے لگی سب باتیں سن رہی تھیں، میں سوچتی ہوں۔

گلی میں چلتے ہوئے مجھے لگتا ہے گھروں کے مکینوں کی آنکھیں دروازوں کی جھریوں، کھڑکیوں کی اوٹ سے مجھ پر اور نعمان پر لگی ہوئی ہیں۔ کوئی دروازہ کھول رہا ہے، کوئی کھڑکی بند کر رہا ہے۔ ایک گھر کی چھت سے ایک بوڑھا آدمی ہم دونوں کو غور سے دیکھتا ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں چھت پر ٹہلنا؟ شاید اس محلے کے لوگ عام حالات میں بھی ایک دوسرے پر نظر رکھنے کے عادی ہیں، اور آج کل تو کورنگی کے حالات بہت خراب ہیں۔ کوئی تعجب نہیں اگر وہ ہر ایک کو شبہے کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے ہوں۔

میں شکیلہ کے گھر واپس آتی ہوں۔ نعمان اب تک ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی چھوٹی چھوٹی گہری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اس کا چہرہ جذبات سے عاری ہے۔ خدا جانے اندر کتنے طوفان دفن ہیں، میں سوچتی ہوں۔ محاصرے کے دن نعمان کو رینجرز والے لے گئے تھے۔ اٹھارہ دن رکھا۔ اس نوجوان پر کیا گزری ہوگی؟

''تم پڑھتے ہو؟'' میں بات شروع کرتی ہوں۔

''میٹرک کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی،'' وہ کہتا ہے۔ ''تین سال تک میں صدر میں ایک سنار کی دکان پر کام کرتا رہا۔ پھر ابا کی درزی کی دکان پر بیٹھنے لگا۔ لیکن ابا بیمار رہتے ہیں اور دکان آئے دن بند ہوتی ہے۔ مجھ سے اب وہاں نہیں بیٹھا جاتا۔''

''تو آج کل کیا کر رہے ہو؟''

''سنار کی دکان پر دوبارہ جانے لگا ہوں۔''

''آج نہیں گئے؟'' وہ خاموش ہے۔

نعمان کے چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ دو بڑے بھائی شادی شدہ ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔ ایک بھائی امریکہ میں ہے اور ایک ایم کیو ایم میں۔ ''یہ بھائی ہمارے ساتھ نہیں رہتا۔''

فوجیوں نے اس کے ساتھ کیا کیا اٹھارہ دن تک؟ ''انھوں نے ہماری آنکھوں پر اٹھارہ دن تک پٹی باندھے رکھی۔ جس کمرے میں مجھے رکھا گیا تھا وہاں بتیس لڑکے تھے۔ وہ ایک بے حد تنگ کمرہ تھا۔'' میں تصور کرنے کی کوشش کرتی ہوں ایک چھوٹے سے کمرے میں ۳۲ لڑکے جن کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ کیا وہ سب کے سب فرش پر بیٹھ سکتے تھے؟ یا کھڑے تھے؟ بنیادی ضروریات؟

''دو دن میں انھوں نے ہمیں پاخانے تک آنا جانا سکھا دیا تھا۔ کھانے کو دیتے تھے۔ ہر تیسرے دن ہمیں بیان

دہرانا ہوتا تھا۔ اگر ایک لفظ کا فرق ہوجاتا تو مارا جاتا۔ اٹھارویں دن مجھے پولیس اسٹیشن لایا گیا اور وہاں سے رہا کیا گیا،'' نعمان نے مختصراً بتایا۔

''تم ایم کیوایم چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' میں پوچھتی ہوں۔

''اب دلی لگاؤ پیدا ہوگیا ہے۔'' وہ بچوں کی طرح مسکراتا ہے۔

چار سال پہلے نعمان کے بھائی نے امریکہ کی ویزا لاٹری میں درخواست ڈالی تھی۔ اس کا نام نکل آیا۔ جب سے وہ وہیں ہے۔ ''تم امریکہ جانے کی نہیں سوچتے؟'' میں سوال کرتی ہوں۔

''مستقبل کی سوچ ختم ہوگئی ہے۔ خدا جانے ایک گھنٹے بعد کیا ہوجائے۔ ایسے میں کل کا سوچنا ناممکن ہے۔'' اب اس کی مسکراہٹ تھکی تھکی سی ہے۔

میں اس نوجوان لڑکے کی اندر کی دنیا کے بارے میں سوچتی ہوں۔ کیسی دنیا ہوگی یہ؟ خوابوں کی دھنک، امید کی کرنوں اور جوان محبت کی آرزوؤں کے بغیر یہ دنیا کتنی تاریک ہوگی! فکر اور اندیشے، نفرت اور انتقام، گولیاں اور خون، پولیس اور رینجرز۔ اور نائن زیرو۔ تنگ دائروں کے درمیان گھومتی ہوئی دنیا۔ مجھے اپنے اندر ایک سنسناہٹ دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

نعمان اٹھارہ دن بعد گھر آیا تو شکیلہ اپنے بیٹے اور نعمان کو اس کے گھر والوں کی اجازت سے لاہور لے گئیں۔ ''میں لاہور رشتے داروں کے پاس رک گئی اور نعمان اور علی کو اسلام آباد اور مری بھیج دیا۔ نعمان کو تبدیلی کی شدید ضرورت تھی۔ اس کی اماں کا بھی خوف اور دکھ سے برا حال تھا کہ کہیں دوبارہ نہ اٹھالے جائیں،'' وہ بتاتی ہیں۔

ان محلوں کے مکینوں کی زندگیاں آپس میں اس طرح گتھی ہوئی ہیں کہ ایک خارجی شخص کے لیے اس کو سمجھنا مشکل ہے۔ ''کیا آپ کو کبھی یہ ڈر نہیں لگتا کہ کہیں آپ کے بیٹے بھی ان چکروں میں نہ آجائیں؟'' میں شکیلہ سے سوال کرتی ہوں۔ آخر وہ ایم کیو ایم کے لڑکوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ''ہماری زندگی جہنم بن کے رہ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے میں خوف اور وسوسوں کی آگ میں جل کر خاکستر ہوجاؤں گی۔ ذہنی پریشانی اتنی شدید ہے کہ مجھے مستقل سر درد اور ہائی بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں اور میرے شوہر اس کوشش میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں کہ ہمارے لڑکے سیاست سے دور رہیں۔ یقین جانو جتنی دیر میرا بیٹا دکان پر بیٹھتا ہے میں دروازے کی پٹی سے لگی گلی میں دیکھتی رہتی ہوں — دکان نظر آتی ہے یہاں سے — کہ کس سے بات کر رہا ہے، کون آیا ہے دکان پر۔ اب تو اتنے برے حالات ہیں کہ لڑکے خود بھی ایم کیوایم سے دور رہنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے بچپن کے دوستوں سے قطع تعلق تو نہیں کر سکتے۔ انھی گلیوں میں ساتھ ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے ہیں، ایک ہی اسکول میں پڑھے ہیں۔ کتنے دن، کتنی شامیں اکٹھے گزاری ہیں۔ ہم اپنے بچوں

سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم ان سے نہ ملو۔ دوسری بات یہ کہ اگر ہم چاہیں بھی تو اب یہ تعلقات ختم نہیں کر سکتے۔ ہمیں سب کے ساتھ ہنس بول کر رہنا ہے۔ یہ ہمارے اپنے مفاد میں ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی سلام دعا رکھنی پڑتی ہے۔ ہر طرف مخبر لگے ہوئے ہیں۔ سی آئی اے کے، ایف آئی ٹی کے، حقیقی کے، ایم کیو ایم کے۔"

"کیا میں تمھاری اماں سے مل سکتی ہوں؟" میں نعمان سے کہتی ہوں۔

"کیوں نہیں۔" نعمان اٹھ پڑتا ہے۔ ہم دونوں اس کے گھر آتے ہیں۔ چھوٹا سا دو کمروں کا گھر ہے — ٹی وی، فرج، واشنگ مشین اور فون۔ اماں بوڑھی ہیں لیکن دبلی پتلی۔ جسم میں پارہ بھرا ہے، اور زبان زہر اگل رہی ہے۔

"جب جی چاہتا ہے چھلانگ مار کر آ جاتے ہیں۔ کمرے کے دروازوں کو لات مار کر کھولتے ہیں۔ ایسے ٹرک بھر بھر کر آتے ہیں جیسے انڈیا فتح کرنے جا رہے ہوں۔ پورے گھر میں چھا جاتے ہیں۔ اندھیرا کر دیتے ہیں۔ ہمارے گھر میں چھبیس دفعہ چھاپا مار چکے ہیں۔ چھبیس دفعہ! سب کچھ تہس نہس کر دیتے ہیں۔ ذلیل کرتے ہیں۔ حقارت آمیز لہجے میں چیختے چنگھاڑتے ہیں۔ اس میں میرا کیا قصور ہے اگر میرا بیٹا ایم کیو ایم میں ہے؟ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہو؟"

نعمان کا بڑا بھائی، ۲۳ سالہ سلمان، ایم کیو ایم کا سرگرم کارکن ہے۔ "وہ اس چھت کے نیچے ڈھائی سال سے نہیں سویا ہے۔ مجھے نہیں پتا میرا بیٹا کیا کھاتا ہے، کہاں سوتا ہے، کیسے جیتا ہے۔ مجھے اس کی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ وہ سائے کی طرح آتا ہے ہمیں پوچھنے، اور دس پندرہ منٹ میں ہوا کے جھونکے کی طرح نکل جاتا ہے۔ میں چھاپوں کے خوف سے اور بیٹے کی ایک جھلک کی آس میں راتوں کو سو نہیں پاتی ہوں۔ میرے دونوں بڑے بیٹے میرے ساتھ ہی رہتے تھے لیکن آئے دن کے چھاپوں سے میرے پوتے پوتیاں بیمار رہنے لگے تھے۔ اسکول بھی آئے دن بند رہتے ہیں یہاں۔ مجبور ہو کر میرے دونوں بیٹے شہر میں کرائے کے مکانوں میں اٹھ گئے ہیں۔"

"آپ اپنے بیٹے سے نہیں کہتیں کہ ایم کیو ایم سے نکل جائے؟" میں سوال کرتی ہوں۔

"وہ کہتا ہے میں نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ میرے لیے اِدھر بھی موت ہے اُدھر بھی موت ہے۔ پارٹی چھوڑ دے گا تو کیا بچ جائے گا؟"

"شروع میں آپ لوگوں نے منع کرنے کی کوشش کی تھی؟"

"وہ ۱۹۸۵ء میں ایم کیو ایم میں شامل ہوا تھا۔ تب وہ تیرہ سال کا تھا اور آٹھویں میں پڑھ رہا تھا۔ اس کے باپ درزی کی دکان کرتے ہیں۔ رات کو دیر سے لوٹتے تھے۔ مجھے گھر بار سے ہی فرصت نہ ملتی تھی۔ بس جب ہمیں پتا چلا اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ وہ ہماری سنتا ہی نہ تھا۔"

نعمان کے والدین ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے تھے۔ اس وقت دو بیٹے تھے ان کے۔ چھ بچے کراچی میں پیدا ہوئے۔ ''کئی سال کینٹ اسٹیشن کے قریب جھگیوں میں رہے۔ پھر پیسہ پیسہ جوڑ کر کورنگی میں چھوٹی سی زمین خریدی۔ اٹھارہ سال سے کورنگی میں ہیں۔''

میں باہر نکل آتی ہوں۔ ایک چھ سالہ بچی ننگے پاؤں، ملگجی فراک پہنے، خاک آلود گلی میں اپنے گھر کے باہر پودا لگانے کی کوشش کر رہی ہے۔ خوشنما سبز رنگ کا پودا — غالباً سوسن کی شاخ ہے۔ بچی نے زمین میں گڑھا نہیں کھودا ہے۔ بلکہ شاخ کے نچلے سرے کو پتھریلی زمین پر رکھ کر مٹی سے ڈھانپ دیا ہے۔ وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے مٹی کو جما رہی ہے اور پلاسٹک کے ایک پرانے مگ سے اس پر پانی انڈیلتی جا رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی صرف ایک چھوٹی سی بنیان پہنے، مٹی بھرے پاؤں لیے اس سارے عمل کو بغور دیکھ رہا ہے۔

دوپہر کی چبھنے والی دھوپ میں چمکیلی سبز شاخ، خاک آلود، بے رنگ گلی میں اتنی بے جوڑ لگ رہی ہے کہ تقریباً مضحکہ خیز نظر آ رہی ہے — اتنا لاحاصل، اتنا بے مصرف کام۔

ماحول ایک اداس کرنے والی کیفیت سے بوجھل ہے۔ بنجر زمین، نہ آگہی، نہ وسائل۔ صرف ایک موہوم سی آرزو۔

میں آگے بڑھتی ہوں۔ گلی کے موڑ پر سوسن کی ایک اور شاخ زمین پڑی ہے۔ خاک اور دھول سے اٹی سبز پتیاں دھوپ میں مرجھا چکی ہیں۔

❄

ڈسٹرکٹ سنٹرل

حسن اسکوائر سے لیاقت آباد کی طرف آتے ہوئے، غریب آباد سے گزر کر اگر آپ مین روڈ پر سیدھے چلتے ہوئے الکرم اسکوائر کی طرف آئیں تو آپ کو بائیں طرف فٹ پاتھ پر جا بجا سرخ چھتوں والے اسٹال نظر آئیں گے۔ پہلی دفعہ ان پر میری نظر چند سال پہلے پڑی تھی۔ اُس رات مجھے یوں لگا تھا جیسے یہ اسٹال لیاقت آباد غریب آباد کے تشدد آمیز لاوے سے اچانک نکل کر وجود میں آ گئے ہوں۔ لکڑی کا چبوترا جس کے چار کونوں پر بانس نکلے ہوئے، ان پر خوشنما سرخ چادر تنی ہوئی، چبوترے پر دھرا ایک بڑا سا مٹکا جس کا منہ سفید کپڑے سے ڈھکا ہوا، اور مٹکے کے پاس کرتے پاجامے میں ملبوس، سفید دو پلی ٹوپی سر پر اوڑھے، داڑھی والا شخص بیٹھا ہوا۔ میں ستائشی نظروں سے ان قلفی والوں کی قطار کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ مجھے ان کی ہمت، ان کے استقلال اور ان کے طمطراق پر رشک آ رہا تھا۔ کراچی،

ڈسٹرکٹ سنٹرل، میں اتنے تباہ کن، پُرتشدد حالات کے باوجود سلیقے سے روٹی کمانے کے فن پر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ دو چار گاہک، جو غالباً قریبی گلیوں کے مکین ہوں گے، اسٹال کے سامنے پڑی کرسیوں پر بیٹھے تھے، اور ایک دو گاڑیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں۔ اور ان میں بیٹھے لوگ غریب آباد کی خاص دلہبار قلفی کے مزے لے رہے تھے۔ قلفی واقعی بے حد خوش ذائقہ تھی۔

ایک اور دفعہ ہم ذی شان ساحل کو الکرم اسکوائر کے پیچھے ان کے گھر چھوڑنے کے لیے اس راستے سے گزرے تھے۔ اس دن شہر کے حالات بے حد خراب تھے۔ ایم کیو ایم کا ایک سرگرم کارکن تحویل میں مارا گیا تھا اور افواہوں کا زور تھا۔ لیاقت آباد میں دو بسیں جلائی جا چکی تھیں اور دوسرے دن ہڑتال ہونے کی تصدیق ہو چکی تھی۔ مغرب کے بعد کا وقت تھا۔ سڑک سنسان پڑی تھی، گلیوں اور فٹ پاتھوں پر کوئی چلتا پھرتا نظر نہیں آرہا تھا۔ اور ایسے میں دلہبار قلفی والے اپنے چبوتروں پر خاموشی سے بیٹھے خالی سڑک کو تک رہے تھے۔ چبوتروں کے بانسوں سے بندھی ٹیوب لائٹوں کی نیلی دودھیا کرخت روشنی میں وہ پراسرار سے، کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہو رہے تھے۔

آج نومبر کی ستائیس تاریخ ہے، سن ۱۹۹۵ء، اور صبح کا وقت۔ میں اسی جگہ سے گاڑی چلاتی ہوئی گزر رہی ہوں۔ وہ تمام اسٹال اس وقت اُجڑے پڑے ہیں۔ بانسوں پر سے سرخ چادریں غائب ہیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ والی آٹو گیراج اور مکینک کی دکانیں ابھی بند ہیں۔ میں سوچتی ہوں، کیا آج کل بھی شام میں قلفی والے اپنے ٹھیلے جما کر روزی کماتے ہیں؟ میں دس نمبر لیاقت آباد کے چوراہے سے بائیں طرف مڑتی ہوں۔ چوراہے پر رش ہے۔ منی بسوں، کوچوں، سوزوکی پک اپس، گاڑیوں، گدھا گاڑیوں، موٹر سائیکلوں، پولیس موبائلوں، رینجرز کی بکتر بند گاڑیوں اور پیدل چلنے والوں کی ملی جلی بھیڑ۔ یہ لیاقت آباد ہے۔ داہنی طرف لیاقت آباد کی سپر مارکیٹ ہے جس میں چھوٹی بڑی دکانوں کا ایک جال بچھا ہوا ہے اور جہاں ہر نوعیت کا سامان دستیاب ہے، جیسا کہ لیاقت آباد کے ایک مکین نے برمحل کہا، ''بیٹی کا پورا جہیز یہاں سے خریدا جا سکتا ہے — فرنیچر، بنارسی جوڑے، سوتی کپڑے، زیورات، برتن، الیکٹرانک کا سامان، گھریلو اشیا، خشک میوہ، سوئی دھاگے — لیاقت آباد سے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔''

اور واقعی لیاقت آباد — جو اَب تک لالوکھیت کے نام سے مشہور ہے — اور اس سے ملحق علاقے ناظم آباد، پاپوش نگر، گولی مار، غریب آباد — شہر کے اندر ایک شہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پولیس کے چھاپوں، دہشت گردوں کی فائرنگ، رینجرز کے محاصروں، ڈاکوں، بھتوں، قانونی اہلکاروں کے ناجائز دباؤ اور رشوت خوری کے باوجود کاروباری سرگرمیوں سے بھرپور، خود پرور اور بظاہر حسبِ معمول۔ یہ ہے کراچی ڈسٹرکٹ سنٹرل۔

لیکن اس سطح کے نیچے، اگر آپ اس علاقے کے رہنے والوں سے بات کریں تو آپ کو احساس ہوگا کہ ایک نظام

ہے جو آہستہ آہستہ ڈھے رہا ہے معیشت میں جمود، بکھرتا ہوا سماجی ڈھانچا اور تنزل پذیر تعلیمی نظام۔

''کاروبار تقریباً ٹھپ ہے۔ ہڑتال کے دن پوری مارکیٹ ہی بند ہوتی ہے۔ عام دنوں میں بھی اگر ذرا سی افواہ پھیل جائے کسی گڑ بڑ کی تو کوئی مارکیٹ میں قدم ہی نہیں دھرتا۔ دکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں،'' عبدالقدوس کہہ رہے ہیں۔ وہ پچپن ساٹھ برس کے ہوں گے، سرمئی اور سفید بال، موٹی شیشوں کی عینک چڑھائے، چہرے سے تھکن کے آثار نمایاں ہیں۔ لیاقت آباد سپر مارکیٹ میں عبدالقدوس کی دکان ہے جس میں سلے سلائے، کام دار، ریشمی جوڑے بکتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹوں اور کاریگروں کے ساتھ زردوزی اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔

''پہلے تو دور دور سے لوگ لیاقت آباد خریداری کرنے آیا کرتے تھے۔ کہاں کہاں سے گاہک آتے تھے ہمارے پاس، نارتھ ناظم آباد، کورنگی، اورنگی، لانڈھی، لیاری، ملیر۔ لیکن اب تو قریبی علاقوں کے لوگ بھی آتے ہوئے گھبراتے ہیں کہ خدا جانے کس وقت کیا ہو جائے۔''

قدوس لیاقت آباد میں اسّی مربع گز کے مکان میں رہتے ہیں۔ ان کے آٹھ لڑکے اور پانچ لڑکیاں ہیں۔ دو لڑکوں اور دو لڑکیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ''ہمارا علاقہ تو پھر بھی قدرے محفوظ ہے۔ وہ اس طرح کہ ہماری گلی اور آس پاس کی گلیوں کے لڑکے ان چکروں میں نہیں ہیں۔ لیکن غریب آباد سے پیلی کوٹھی تک کے علاقے میں حقیقی والوں کا زور ہے،'' قدوس کی بیوی بچوں کو ناشتہ دیتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔

یہاں آج کل ''قدرے محفوظ'' کا مطلب ہے کہ آپ کے گھر کے عین سامنے کوئی پولیس مقابلہ نہ ہوا ہو اور رینجرز نے آپ کی گلی کا محاصرہ نہ کیا ہو۔

''ورنہ گولیوں کی آوازیں تو معمول کی بات ہیں۔ اگر کہیں دور بھی فائرنگ ہو رہی ہو تو لگتا ہے سر پر ہو رہی ہے،'' ان کی ستائیس سالہ لڑکی صغرا اپنے دو سالہ بچے کو بہلاتے ہوئے ہنس کر بتا رہی ہے۔ صغرا کا شوہر مرچنٹ نیوی میں ملازم ہے اور عموماً جہاز پر رہتا ہے۔ صغرا اپنے دو کمروں کے گھر میں تالا ڈال کر زیادہ تر میکے میں وقت گزارتی ہے۔ ''حالات اتنے خراب ہیں۔ اکیلے رہتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ رات میں بھی ادھر ہی سوتی ہوں۔''

''فائرنگ کے بعد یہاں کا دوسرا معمول ڈاکے ہیں۔ یہی لڑکے ڈاکا ڈالتے ہیں۔ سُسرے سب بدمعاش ہیں۔ جس گھر میں گھس جائیں، سب کچھ لے جاتے ہیں، زندگی بھر کی جمع پونجی،'' قدوس بڑبڑاتے ہیں۔ ''چوبیس گھنٹے دروازہ بند رکھنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا باہر سے کنڈی لگا کر میں پڑوس چلی جایا کرتی تھی،'' ان کی بیوی پرانے وقتوں کو یاد کرتی ہیں۔ قدوس لالوکھیت میں چالیس سال سے رہائش پذیر ہیں۔ ''پاکستان آ کر یہیں ڈیرا ڈالا تھا۔''

''یہاں کا تیسرا معمول ہے رینجرز اور پولیس کی کارروائیاں،'' وہ استہزائیہ انداز میں کہہ رہے ہیں۔ ''جس کو

چاہیں پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ چھوٹتے ہی لاکھ دولاکھ مانگتے ہیں اور دس پانچ ہزار لیے بغیر نہیں چھوڑتے۔''

''اور اگر لڑکے کچھ کہنے کی کوشش کریں تو کاٹ مار کر پھینک دیتے ہیں اور کہتے ہیں ایم کیو ایم نے مارا۔ ابھی پچھلے دنوں سندھی ہوٹل کی طرف ایک بوری ملی تھی۔ لوگ کہنے لگے ہاتھ پاؤں ہل رہے ہیں۔ رینجرز آئے۔ بوری اٹھا کر لے گئے۔ کیا کیا ہوگا اس کے ساتھ؟ کیا پتا۔ مار مُور کر پھینک دیا ہوگا''، ان کی بیوی بولے جا رہی ہیں۔

''اگر رینجرز سے آپ بچ نکلے تو علاقے کے لڑکے تو کہیں نہیں گئے۔ وہ تو بیٹھے ہیں آپ کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے۔ پچھلے ہفتے، میری دکان کے قریب ایک بڑی دکان ہے سوٹ کے کپڑوں کی، وہاں تین لڑکے مغرب کے وقت گاہک بن کر آ گئے۔ مارکیٹ کی دکانیں بند ہو رہی تھیں۔ ان لونڈوں نے کئی ہزار کے سوٹوں کے کپڑے خریدے۔ پیسے بھی نہیں دیے اور ساتھ میں دکان کی تجوری بھی لے گئے، ہتھیار لہراتے ہوے۔ کون چوں چرا کر سکتا ہے ان حالات میں؟ چند دنوں پہلے تک یہ لڑکے تمام دکانداروں سے بھتہ وصول کرتے تھے لیکن اب لوگ عاجز آ گئے ہیں ان ہتھکنڈوں سے۔ گزارے بھر کے لیے ہی آمدنی ہو جائے تو بڑی بات ہے۔ ایسے میں کون بھتہ دے؟ اب دکاندار مزاحمت کرنے لگے ہیں۔ ایک ماہ پہلے حیدری کی دکانیں اسی وجہ سے چار دن تک بند رہیں۔ دکانداروں نے بھتہ دینے سے انکار کیا اور دکانیں بند کر کے بیٹھ گئے کہ جاؤ، کاروبار ہی نہیں کریں گے تو بھتہ کہاں سے لو گے۔ لیکن کتنے دن یہ معاملہ چل سکتا ہے؟ اور پھر لڑکے بھی کوئی کم نہیں ہیں۔ بھتہ نہ دو تو دن دہاڑے لوٹ کر لے جاتے ہیں۔''

عبدالقدوس کے تین بڑے بیٹے زردوزی اور سلائی کا کام کرتے ہیں۔ دو بیٹے ایک چھوٹی سی اسٹیشنری کی دکان چلاتے ہیں۔ چھوٹے بیٹے نے انٹر سائنس کا امتحان پاس کیا ہے۔ اُسے بی ایس سی میں داخلہ نہیں مل سکا ہے۔

''کالجوں میں پڑھائی کہاں ہوتی ہے اب؟'' قدوس کی بیوی بولیں، ''آئے دن تو ہنگامے ہوتے رہتے ہیں۔ فائرنگ کے خوف سے والدین خود بھی زیادہ زور نہیں دیتے کہ کالج جاؤ۔ اب تو ٹیوشن سنٹروں کا راج ہے۔ یہ بھی جاتا ہے ٹیوشن سنٹر۔''

سترہ سالہ عدنان اردو سائنس کالج کا طالب علم ہے۔ وہ کالج کی زندگی سے بیزار ہے۔ ''کالج میں گروپ بنے ہوے ہیں۔ جمعیت، پنجابی پختون، ایم کیو ایم، حقیقی۔ آئے دن لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ جو پڑھنے والے ہیں وہ گھبرا جاتے ہیں۔ کل میں کالج گیا تھا۔ فائرنگ ہوگئی۔ لڑکوں نے آپس میں کی۔ کیا کرتا؟ الٹے قدموں گھر کو لوٹ آیا۔ کالج میں داخل ہو تو مختلف پارٹیوں کے لڑکے کونے میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں آؤ، ہمارے ساتھ بیٹھو۔ جو لڑکے ان چکروں میں نہیں ہیں اور پڑھائی کرنا چاہتے ہیں وہ کسی نہ کسی سورس سے حاضری پوری لگوا لیتے ہیں اور گھر یا ٹیوشن سنٹر میں کورس پورا کرتے ہیں۔

''اگر لڑکے پڑھنے کے لیے کالج آ بھی جائیں تو ٹیچر اکثر غائب رہتے ہیں۔ یا پھر جلدی چلے جاتے ہیں۔ کلاس میں لڑکے کم تعداد میں ہوں تو ٹیچر پورا پیریڈ نہیں لیتے۔ بہرحال، بات صرف اتنی ہے کہ پڑھنا تو آپ کو خود ہی ہے۔ اگر آپ بغیر ٹیوشن کے پڑھ سکتے ہیں تو خود ہی مغز کھپائیں ورنہ ماں باپ کے پیچھے پڑیں کہ ٹیوشن کے پیسے دو۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ مجھے بی ایس سی میں داخلہ مل بھی جاتا تو کیا مجھے اس کے بعد نوکری مل جاتی؟'' وہ پوچھتا ہے۔

عدنان پاکستان امریکن کلچرل سنٹر میں داخلہ لے رہا ہے۔ ''انگریزی بہتر کرنا چاہتا ہوں۔'' آج کل کیا مشاغل ہیں؟ ''دوپہر میں اسٹیشنری کی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ مال لینے بھی جاتا ہوں۔ گھر میں ہوتا ہوں تو رسالے وغیرہ پڑھتا ہوں اور میوزک سنتا ہوں۔ جمعے کو کرکٹ ہوتی ہے۔ محلے میں ٹیمیں بنی ہوئی ہیں۔ روز رات کو بیڈمنٹن کھیلی جاتی ہے۔ فلیش لائٹ محلہ کمیٹی نے حفاظتی اقدام کے طور پر لگائی ہے۔ آٹھ سے دس بجے تک کھیلتے ہیں۔''

لیاقت آباد کے بچے اور نوجوان گھر میں قید ہو کر رہ گئے ہیں۔ بچیوں کے تو باہر نکل کر گلی میں کھیلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ والدین کی کوشش ہوتی ہے کہ لڑکے بھی باہر گلیوں میں نہ جائیں۔ ''میرے کئی دوست لیاقت آباد کے مختلف علاقوں میں رہتے ہیں۔ کوئی دس نمبر میں ہے تو کوئی چار نمبر میں۔ لیکن میں ان سے ملنے ان کے گھر نہیں جا سکتا کیونکہ ان علاقوں میں زیادہ گڑبڑ رہتی ہے۔ خدا معلوم کس وقت کوئی گولی کہاں سے آ جائے اور آپ اللہ کو پیارے ہو جائیں۔ گولی کے علاوہ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ کہیں رینجرز آپ کو اٹھا نہ لے جائیں۔''

عدنان کا خیال ہے آج کل حالات قدرے بہتر ہیں کیونکہ ''آس پاس کی گلیوں سے بوریوں میں بند لاشیں ملنا کم ہو گئی ہیں، اور ہم دس بجے رات تک گھر کے سامنے کھیل سکتے ہیں۔'' لیاقت آباد میں ایسا وقت بھی آ چکا ہے کہ آٹھ بجے گلیوں میں ہُو کا عالم طاری ہو جاتا تھا۔

میں اب لیاقت آباد فرنیچر مارکیٹ سے گزرتی ہوئی، بڑا میدان اور ریلوے پھاٹک عبور کرتی ہوں۔ یہ پاپوش نگر کا آخری سرا ہے۔ بائیں جانب اورنگ آباد ہے۔ سڑک تنگ ہے اور دونوں طرف سے ٹریفک آ جا رہا ہے۔ سڑک کے اطراف چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں — حجام، حلوائی، اسٹیٹ ایجنسیاں، بیکری، درزی، وڈیو، ویلڈر۔ ہر بلاک کے بعد تنگ متوازی گلیاں ہیں جو رہائشی علاقے میں کھلتی ہیں۔ اورنگ آباد کی گلیوں کے دونوں طرف ساٹھ مربع گز پر بنے ایک منزلہ، دو منزلہ مکانات ہیں۔ گلیاں پکی ہیں۔ عقبی تنگ گلیاں بھی صاف ستھری ہیں۔ گٹر کے ڈھکن بند ہیں اور کوڑا کرکٹ بھی نظر نہیں آتا۔ غالباً جب مختصر عرصے کے لیے ایم کیو ایم کی لوکل باڈیز میں حکومت رہی، یہاں کی حالت سدھری تھی۔ لوگ اب تک صفائی ستھرائی کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن ان چھوٹے چھوٹے گھروں کی پختہ دیواریں مکینوں کے ذہنی تناؤ اور خوف سے گونج رہی ہیں۔ اس

علاقے میں کئی مرتبہ پولیس چھاپے مار چکی ہے۔ رینجرز محاصرہ بھی کر چکے ہیں۔

چھوٹے قد اور گُھلے ہوئے جسم والی نسیمہ پچاس کے پیٹے میں ہیں۔ ان کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے ہیں، دانت پان سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ وہ کبھی سرگوشیوں میں اور کبھی اچانک تیز ہوتی ہوئی آواز میں مجھے اپنی روداد سنا رہی ہیں: ''رات کے گیارہ بجے آئے تھے۔ ذرا سوچو، یہ چھوٹا سا گھر، اور دس موٹے تازے سپاہی تلاشی لے رہے ہیں! چیزیں الٹ پلٹ کر دیں۔ الماریاں، درازیں، صندوق، سب کچھ کھلوا لیا۔ پھر ایک نے چلّا کر پوچھا، لڑکے کدھر ہیں تمھارے؟ میں نے کہا صاحب، رات کی ڈیوٹی پر گئے ہوئے ہیں بچے۔ سلیمان کہاں ہے؟ دوسرے نے غرّا کر پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ انھیں سلیمان کا نام کیسے معلوم ہوا؟'' نسیمہ کا بیٹا سلیمان گزشتہ پانچ سال سے سعودی عرب میں محنت مزدوری کر رہا ہے۔ ''وہ ارسلان کو اٹھا کر لے گئے۔'' تیئیس سالہ ارسلان ایک فیکٹری میں ملازمت کرتا ہے۔ نسیمہ کے شوہر تین سال سے بے روزگار ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ نسیمہ نے بڑے بیٹے کو اطلاع دی جو بیوی بچوں کے ساتھ قریب ہی گلی میں رہتا ہے۔

''رات گزر گئی تھی اور ہم کچھ نہ کر سکتے تھے۔ میں نے اپنے حواس یکجا رکھے اور سلیمان کے کاغذات کی فائل بناتا رہا۔ اس کے بھیجے ہوئے ڈرافٹ کی نقلیں، سعودی عرب سے ساتھ لائے ہوئے کیسٹ ریکارڈر اور دوسری چھوٹی موٹی چیزوں کی رسیدیں، اس کے خطوط اور لفافے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اکٹھا کیے۔ اماں پوری رات بیٹھی روتی رہیں،'' سبحان مجھے بتاتا ہے۔

صبح سویرے سبحان اماں کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر ارسلان کی تلاش میں نکلا۔ ''لے جاتے وقت بتاتے تھوڑا ہی ہیں کہ کہاں لے جا رہے ہیں۔ ہم کراچی کے سولہ تھانوں میں گئے۔ زیادہ تر تھانوں کی پولیس بری طرح پیش آئی۔ کوئی ہماری کہانی سننے کو تیار ہی نہ تھا کہ سلیمان، جس کو رینجرز نے پوچھا تھا، پانچ سال سے ملک سے باہر ہے اور ارسلان جس کو لے گئے، اس کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں۔

''چند ایک تھانوں میں پولیس نے ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور بتایا کہ فلاں تھانے میں جاؤ۔ آخرکار ایک تھانے کے انچارج نے تفصیل سے ہماری کہانی سنی۔ اس نے سلیمان کے تمام کاغذات بغور دیکھے اور ہمیں یقین دلایا کہ اگر تمھارے بھائی کا ایم کیو ایم سے کوئی تعلق نہیں ہے تو تمھیں تمھارا بھائی واپس مل جائے گا۔ سات بجے شام کو آنا۔''

شام کو جب نسیمہ اور سبحان پولیس اسٹیشن پہنچے تو ارسلان کو ان کے حوالے کر دیا گیا۔ ''انھوں نے ہم سے کچھ نہیں مانگا، گو کہ ہمیں بتایا کہ یہ کیس اتنا پیچیدہ تھا کہ انچارج کو سی آئی اے کے افسران کو کیس سمجھانے میں پورا ایک گھنٹہ لگا،

اور یہ کہ اس کیس کے ہم سے دو لاکھ روپے طلب کیے جا سکتے تھے۔''

''فرشتہ تھا فرشتہ، خدا اس کو زندگی دے، اس کو اپنی امان میں رکھے!'' کچھ تعجب نہیں کہ نسیمہ ہاتھ اٹھا کر اس کو دعائیں دیتی ہیں۔ اب یہاں جو شخص اپنی ڈیوٹی سیدھے سادے طریقے سے، قانونی ضوابط کے تحت انجام دیتا ہے، انسان نہیں فرشتہ ہے۔ تھانے کے انچارج نے بتایا کہ سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر ایک لڑکے کی جیب سے نکلا تھا جو پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے۔ لہٰذا اب سلیمان کے نام کی فائل کھل گئی ہے اور رینجرز اس کو لینے آئے تھے۔

''وہ لڑکا جس کی جیب سے سلیمان کا نام اور ٹیلی فون نمبر نکلا، اس کی فیملی دس سال پہلے اورنگ آباد میں رہتی تھی۔ سلیمان کی بچپن میں اس سے جان پہچان تھی۔ پھر وہ لوگ لیاقت آباد منتقل ہو گئے۔ اور پھر سلیمان پانچ سال سے سعودی عرب میں ہے، لہٰذا کوئی رابطہ بھی نہ رہا تھا۔''

''ارسلان کی آنکھوں میں پٹی باندھے رکھی اور اسے بہت مارا۔ چوبیس گھنٹے اسے پانی پینے کو نہ دیا۔''

کس سے مارا تھا؟''

''ہاتھوں سے کب مارتے ہیں؟'' نسیمہ میرے احمقانہ سوال پر مسکراتی ہیں۔ ''لاتوں سے مارتے ہیں وہ۔''

جب ارسلان گھر آیا تو اس کی حالت غیر تھی۔ بولا نہیں جا رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے، کپڑے میلے۔ پورے جسم میں درد اور نیل۔ ''ایک ہفتہ بخار میں پڑا رہا۔ چارپائی سے اٹھنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ میں نے آج زبردستی اٹھا کر ڈیوٹی پر بھیجا ہے۔ جتنے دن نہیں جائے گا، پیسے کٹیں گے۔''

ارسلان کو پچیس سو ماہانہ تنخواہ ملتی ہے، غیر حاضری پر تنخواہ کٹتی ہے اور، جیسا کہ چھوٹے کارخانوں میں رواج ہے، کسی قسم کی کوئی سہولت نہیں دی جاتی۔

نسیمہ کے دو لڑکے شادی شدہ ہیں لیکن وہ چھوٹے تین لڑکوں کی طرف سے بے حد پریشان رہتی ہیں اور ان کی صحت خراب رہنے لگی ہے۔ اکیس سالہ فرقان نے ساتویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی تھی۔ ''پانچ سال طارق روڈ کے ایک گیراج میں میں نے مکینک کا کام کیا۔ لیکن وہ مجھے صرف گیارہ سو دیتے تھے اور نو بجے صبح سے نو بجے رات تک کام لیتے تھے۔ تنگ آ گیا تھا، اس لیے کام چھوڑ دیا۔ کئی گیراجوں کے چکر لگا چکا ہوں لیکن اب کام نہیں ملتا۔ آج کل سائٹ ایریا کی ایک مل میں پارٹ ٹائم نوکری کر رہا ہوں،'' دبلا پتلا، شرمیلا فرقان مجھے رک رک کر بتا رہا ہے۔

''میں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ اماں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ ہر وقت باہر نہ نکلو، گھر میں بیٹھو کی رٹ لگائے رکھتی ہیں۔ جب سے بھیا کو رینجرز لے گئے میری اور بھی شامت آ گئی ہے۔ کیا کروں؟ اس کبوتر خانے میں چوبیس گھنٹے بند ہو کر گزاروں؟ میرا دم گھٹتا ہے۔ اور پھر میں جاتا ہی کہاں ہوں بھلا؟ تازہ ہوا کے لیے گلی ہی میں تو کھڑا

ہوتا ہوں۔ اگر گھر میں رہ کر وی سی آر دیکھوں تو اس پر بھی اماں چیختی ہیں کہ فلمیں مت دیکھو۔''

''ہاں، میں نہیں چاہتی کہ میرے بچے تمام وقت انڈین فلمیں دیکھتے رہیں۔ کبھی کبھار دیکھ لیں تو کوئی بات نہیں۔''

نسیمہ کا چھوٹا بیٹا تیرہ سال کا ہے اور اس نے بھی پڑھائی چھوڑ دی ہے۔ ''تمام وقت گلیوں میں آوارہ گردی کرتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔ ان کی وجہ سے مجھے بلڈ پریشر رہنے لگا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں ارسلان کی جلد از جلد شادی کر دوں اگر پکی نوکری لگ جائے اس کی۔ شادی کے بعد گھر تو بیٹھے گا بال بچوں کے ساتھ،'' نسیمہ کا خیال ہے۔ لڑکیاں مسئلہ نہیں ہیں۔ بڑی کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک نویں میں پڑھ رہی ہے اور سب سے چھوٹی چھٹی جماعت میں۔ اسکول کے علاوہ وہ تمام دن گھر میں بند رہتی ہیں اور گھر کے کام کاج میں اماں کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔

''میں تو اس کا آج اسکول چھڑا دوں۔ مگر آج کل معلوم نہیں کیا ہو گیا کہ جو بھی رشتہ آتا ہے پڑھی لکھی لڑکی مانگتا ہے۔ اس کی منگنی کر دی ہے میں نے، لیکن لڑکا کہتا ہے جب بی اے کر لے گی تب شادی کروں گا،'' نسیمہ کہہ رہی ہیں۔ ''دس سال پہلے کالج یونیورسٹی کی پڑھی لڑکی سے کوئی شادی کرنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔''

پاپوش نگر میں بھی ڈاکہ زنی عام بات ہے۔ ''لڑکے چاہتے ہیں سب کچھ چھین کر لے جائیں۔ لوگ ڈرتے بھی ہیں ان سے۔ کیوں نہ ڈریں؟ بندوقیں جو ہوتی ہیں ان کے پاس۔ لیکن اب تو ان کی دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے کہ ڈنڈے اور پتھر ہی سے کام چلا لیتے ہیں۔ پچھلے ہفتے ہماری گلی میں ڈھائی بجے رات ایک گھر میں لڑکا گھس آیا۔ وہ تو خیر ہوئی، خاتون خانہ کتھا پکا رہی تھیں۔ انھوں نے جو شور مچایا تو پتھر پھینک کر واپس چلا گیا۔ خیریت ہوئی کہ ان کے لگا نہیں۔''

نسیمہ کے پاس ایسی لاتعداد کہانیاں ہیں۔

ساجدہ بیوہ ہیں اور اپنے دو غیر شادی شدہ بیٹیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ پاپوش نگر میں گزشتہ پچیس سال سے رہ رہی ہیں۔ یہ مکانات اسّی مربع گز پر بنے ہوئے ہیں اور گلیاں نسبتاً چوڑی ہیں۔

''دو سال پہلے یہاں حالات بہت خراب تھے۔ ایم کیو ایم اور حقیقی والے آپس میں لڑ مر رہے تھے اور بیچ میں ہم لوگ تباہ ہو رہے تھے۔ کاؤنسلر کے آفس پر قبضے کی جنگ جاری تھی۔ پھر ایک دن رینجرز آئے۔ آفس خالی کروایا، تالا ڈالا، لڑکوں کو اٹھایا اور چلے گئے۔ تب سے نسبتاً سکون ہے۔''

ساجدہ پچاس کے قریب ہوں گی۔ بال ان کے سارے سفید ہے۔ وہ ایک نرم گو خاتون ہیں، ٹھنڈے مزاج کی۔ زندگی کی دھوپ چھاؤں نے ان کو مضبوط بنا دیا ہے۔

''ہم یہاں پچیس سال سے ہیں۔ دو سال کے اندر اندر کئی پرانے مکین گھروں کو بیچ کر چلے گئے۔ جن علاقوں میں زیادہ گڑبڑ ہے وہاں سے لوگ اِدھر منتقل ہو گئے ہیں۔ اب اس محلے میں کسی کو کسی کا پتا نہیں رہا،'' وہ کہہ رہی ہیں۔

پاپوش نگر کے وہ مکین جو اپنا برسوں پرانا گھر اونے پونے بیچ کر کہیں اَور مکان خریدنے کی استعداد رکھتے تھے، یہاں سے جا چکے ہیں۔ ان گھروں میں وہ لوگ منتقل ہو رہے ہیں جو گنجان ترین علاقوں میں ساٹھ مربع گز کے مکانوں میں رہ رہے تھے۔ اسّی مربع گز کے رہنے والے ایک سو بیس مربع گز کے مکانوں میں منتقل ہو رہے ہیں۔ اس غیر معمولی اور جبری منتقلی سے محلوں کے سماجی ڈھانچے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ یگانگت، اپنائیت، پڑوسیوں کا وقت پڑنے پر ایک دوسرے کے کام آنا، مل جل کر محلے کے مسائل کو حل کرنا، یہ ساری قدریں ٹوٹ رہی ہیں اور ان کی جگہ بے حسی، لاتعلقی، خوف، اندیشوں اور بے اعتمادی نے لے لی ہے۔

''چند ماہ پہلے کی بات ہے کہ میں بچیوں کے ساتھ اکیلی تھی۔ بڑا بیٹا کام پر گیا ہوا تھا اور چھوٹا نوکری کی تلاش میں نکلا تھا۔ گلی میں شور ہونے لگا۔ ہمارے گھر کے باہر کچھ لڑکے کھڑے تھے اور نعرے لگا رہے تھے: اس گھر کو آگ لگا دو! میں نے کھڑکی سے جھانک کر پوچھا کیا بات ہے، تو بولے، آپ کے گھر کی چھت سے کسی نے ہم پر پتھر پھینکا ہے۔'' ساجدہ نے حواس جمع رکھتے ہوے، ضبط وتحمل کے ساتھ لڑکوں کو بتایا کہ چھت پر کوئی نہیں ہے سوائے ان کے بوڑھے بہنوئی کے جو عرصے سے بیمار ہیں اور چارپائی سے لگے ہوے ہیں۔ وہ چھت پر بنے ایک کمرے میں رہتے ہیں۔ وہ اٹھ ہی نہیں پاتے تو پتھر کیا پھینکیں گے۔ لڑکوں نے کہا وہ خود آ کر دیکھنا چاہتے ہیں۔ ''میں نے لڑکوں سے کہا، میں انھیں ہرگز اس بات کی اجازت نہیں دوں گی۔ جب میرا بیٹا کام سے آ جائے تو گھر آ کر تلاشی لے لینا۔ ابھی جاؤ یہاں سے۔'' غالباً ان کی آواز کے تحکم اور رعب سے لڑکے ڈھیلے پڑ گئے اور یوں معاملہ رفع دفع ہوا۔

''اگر پرانے محلے والے ہوتے تو یہ واقعہ میرے ساتھ ہرگز نہ پیش آتا۔ لیکن اب سب نئے لوگ ہیں۔ سوائے دو چار خاندانوں کے اَور کوئی ایک دوسرے کو نہیں جانتا،'' انھوں نے بتایا۔

عبدالسلام کا گھرانہ خوش قسمت ہے۔ وہ اس طرح کہ دو سال پہلے وہ اپنا تیس سال پرانا، مین روڈ پر واقع، چھوٹا سا مکان بیچ کر سڑک کے اس پار ایک سو بیس گز کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ ''پرانے گھر میں زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ آئے دن فائرنگ ہوتی۔ ہڑتال کے دن گھر سے ایک قدم باہر نہ نکال سکتے۔ ہم اسکرین پرنٹنگ کا کام بھی گھر پر ہی کرتے تھے اور خریداروں نے مال لینے کے لیے آنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک چنیوٹی خاندان اپنا مکان بیچنے کے لیے پریشان تھا۔ بے حد مناسب قیمت میں مل گیا ہمیں۔'' عبدالسلام کے موجودہ دو منزلہ گھر میں کافی گنجائش ہے۔ تیسری منزل پر ٹین کی چھت ڈال کر ہال میں اسکرین پرنٹنگ کے لیے میزیں قطار سے لگی ہیں۔ کیمرا نچلی منزل کے کمرے

میں سیٹ کیا ہے اور رنگ سازی علیحدہ حصے میں ہوتی ہے۔ اس علاقے میں گھر کے باہر آہنی گیٹ لگے ہوئے ہیں اور گلی کافی چوڑی ہے۔ ''یہ بہتر علاقہ ہے۔ محفوظ بھی ہے، گو کہ ہیں تو اب بھی پاپوش نگر میں۔'' لہٰذا جب ہڑتال ہوتی ہے تو ان کا لڑکا جو کلفٹن میں واقع ایک غیر ملکی کمپنی میں کام کرتا ہے، دو تین دن کے لیے گھر نہیں آتا۔ ''کمپنی کی طرف شہر کے ہوٹل میں کمرہ بک کرا دیا جاتا ہے۔ فون پر رابطہ رہتا ہے۔'' پچھلے دنوں ان کے علاقے کی تمام ٹیلی فون لائنیں، ہفتوں خراب رہیں۔ ''لڑکوں نے ٹیلی فون کی تاریں کاٹ ڈالی تھیں۔ اب ٹیلی فون والوں نے زیرِ زمین تاریں بچھائی ہیں۔''

ٹیلی فون کے کٹے ہوئے تاروں کی واردات کراچی میں معمول بن گئی ہے۔ لیاقت آباد کے کئی علاقے، پی آئی بی کالونی، ایف سی ایریا، شاہ فیصل کالونی اور نارتھ ناظم آباد میں ہفتوں اور مہینوں مکینوں کو، ''لڑکوں، دہشت گردوں، خدا جانے کون،'' کی کارستانی کا خمیازہ بھگتنا پڑا ہے۔

ڈسٹرکٹ سنٹرل کے باسیوں کے لیے زندگی دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔ کراچی کے حالات کی وجہ سے ان کو متفرق مسائل کا سامنا ہے۔

''جب آپ کو ملازمت کے واسطے انٹرویو کے لیے بلایا جاتا ہے تو سب سے پہلا سوال یہ ہوتا ہے آپ کہاں رہتے ہیں؟ جیسے ہی آپ کے منھ سے لیاقت آباد، ناظم آباد، پاپوش نگر کا نام نکلتا ہے تو آپ کو دروازہ دکھا دیا جاتا ہے، معاف کیجیے گا ڈسٹرکٹ سنٹرل کے رہنے والوں کے لیے یہاں جگہ نہیں،'' ستائیس سالہ شمشاد تلخ لہجے میں بتا رہا ہے۔ جب نوکری کی تلاش میں چار پانچ جگہ اس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ''تو آخر مجھے جھوٹ بولنا پڑا۔ میں نے کہا میں سوسائٹی میں رہتا ہوں۔'' سوسائٹی میں شمشاد کے رشتے دار رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب تین دن کی ہڑتال ہوئی تھی، الطاف حسین کے بھائی کے قتل کے ردِعمل میں، تو شمشاد بڑی مشکلوں سے دفتر پہنچ سکا تھا۔ اب شمشاد کی زندگی میں یہ مشکل بھی شامل ہو گئی ہے۔ شمشاد اپنی بیوہ ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ ناظم آباد کے ایک کمرے کے مکان میں رہتا ہے۔

بہت سے خاندان، جن کے لڑکے سیاست سے کسی طور وابستہ نہیں ہیں، اپنے لڑکوں کی طرف سے فکرمند رہتے ہیں۔ اگر اتفاق سے آپ کا لڑکا ایم کیو ایم میں کسی کو جانتا ہے، خواہ یہ واقفیت سرسری اور عارضی نوعیت کی ہی کیوں نہ ہو، آپ کسی بھی مشکل سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ ''ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کب گلی میں چھاپا پڑ جائے، محاصرہ ہو جائے،'' فاطمہ کہتی ہیں۔ فاطمہ بیوہ ہیں اور ان کے دو لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ ان کے ساتھ دوسری نوعیت کا واقعہ پیش آیا۔ ایک دن محلے کے لڑکے ان کے گھر آ گئے۔ ''کہنے لگے، آپ کے دو بیٹے ہیں، ایک بیٹا الطاف بھائی کو دے دیجیے۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ پریشانی سے برا حال کہ کیا کروں۔'' بدقت تمام فاطمہ نے بیٹے کے لیے ریل کے ٹکٹ کا